جلد (۹)، عدد (۴)
ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم ۲۹۵۰

۴۸۶۰

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی! اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو ہی نہیں بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں بھی نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت غیر مجلد (للعہ) سکہ انگریزی (للعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت سکہ انگریزی سکہ عثمانیہ)!

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۵ ہجری جلد ۹ عدد ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

حال میں ہمیں ایک ایسے خادم دین سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا جس کے خلوص، سادگی، ان تھک محنت اور نمود و نمائش سے پرہیز کو دیکھ کر دل پر خاص اثر ہوا۔ ان کا نام مولانا اے۔ کے۔ عبدالحمید ہے۔ کاریکال (فرنچ انڈیا) کے رہنے والے ہیں۔ پرانے طرز کے عالم ہیں مگر ان کی فقیرانہ سادگی اور سیدھی سادھی گفتگو سے کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ علماء کے گروہ سے ہوں گے۔ کئی سال سے خاموشی کے ساتھ ٹامل زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ ان کی محنت شاقہ کے جو نمونے ہم نے دیکھے اُن کو دیکھ کر بے اختیار دل سے نکلا کہ الحمد للہ مسلمانوں میں اب بھی ایسے کام کرنے والے موجود ہیں۔ ٹامل زبان قرآن مجید کی زبان سے بالکل مغائر ہے، اور پھر اسلامی لٹریچر کے لحاظ سے قطعی مفلس بھی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ قرآن کا ایک لفظ بھی ٹامل میں مستعمل نہیں، بلکہ درحقیقت مذہب اسلام کی معمولی اصطلاحات کے لیے بھی اس میں کوئی لفظ نہیں ملتا۔ جنوبی ہند کے مسلمان جو اس زبان کو بولتے ہیں، ان کی اکثریت مذہبی علوم سے قطعی ناآشنا ہے، اور زیادہ سے زیادہ جس مذہبی لٹریچر سے وہ واقف ہیں وہ داستان امیر حمزہ اور ایسے ہی چند افسانوں کے ٹامل ترجمے ہیں۔ ایسی زبان میں قرآن کے معانی بیان کرنا جس قدر مشکل ہوگا اس کا اندازہ ہر صاحب علم کر سکتا ہے۔ مولٰنا نے اس دشوار کام کو اپنے ذمہ لیا اور ایک حصہ کا ترجمہ کر کر کے ٹامل جاننے والے علماء کے پاس بھیجا تا کہ وہ لفظ لفظ کو جانچ کر دیکھیں کہ مفہوم ادا کرنے میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔ پھر ان کی تجاویز کے مطابق ترجمہ میں اصلاح کر کے ٹامل کے پنڈتوں

سے مشورہ لیا کہ زبان کے لحاظ سے تو کوئی نقص نہیں۔ پھر اسے مختلف عامیوں کے سامنے پیش کیا اور ان سے پڑھوا کر مطلب دریافت کیا تاکہ یہ تحقیق ہو جائے کہ آیا ایک ٹامل بولنے والا عامی اس ترجمہ کو سمجھ سکتا ہے یا نہیں۔ ان مختلف امتحانات میں جو حصے کامیاب ہوئے ان کو بحال رکھا اور جو ناکام ہوئے ان میں پھر اصلاح کی اور پھر ان کو دوبارہ امتحان کے لیے پیش کیا۔ اس طرح کئی سال کی محنت و کوشش کے بعد وہ قرآن کا ایک ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس کو بہت سے ٹامل جاننے والے علماء نے مستند و معتبر قرار دیا ہے۔

ترجمۂ قرآن کا یہ کام ایک حد تک انجام پا چکا ہے اور ابھی ایک معتد بہ حصہ باقی ہے۔ اس کام کی تیاری اور اس کی اشاعت کے تمام مصارف کا ذمہ علاقۂ مدراس کے ایک مسلمان تاجر نے لیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس کی مالی حالت خراب ہو گئی اور اب وہ ان کی مدد کرنے سے بالکل قاصر ہے۔ ایسی حالت میں مولٰنا مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنا کام ملتوی کر کے روپے کے انتظام کی طرف توجہ کریں۔ ترجمہ کی تکمیل کافی مصارف چاہتی ہے، کیونکہ اس کے مسودوں کو بار بار طبع کرانا پڑتا ہے اور بعض مواقع پر مولٰنا کو خود علماء اور پنڈتوں سے مشورہ کرنے کے لیے سفر کرنا ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد ترجمہ کی اشاعت کے لیے بھی کافی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ مولٰنا اس امید کے ساتھ حیدرآباد تشریف لائے ہیں کہ یہاں سے سرمایہ کا انتظام ہو جائے گا، مگر ہم نے محسوس کیا کہ وہ بیچارے ان فنون میں سے کوئی فن بھی نہیں جانتے جن سے سرمایہ حاصل کیا جاتا ہے، اور نہ ان ہتھیاروں سے مسلح ہیں جو زر کھینچنے کے لیے ضروری ہیں۔ نہ ان کے پاس لباس مکر ہے، نہ زبان دراز، نہ تملق اور چاپلوسی، نہ خوشامد اور قصیدہ خوانی، نہ پروپیگنڈا اور گندم نمائی و جو فروشی۔ بلکہ جس سادہ وضع سے وہ تشریف لائے ہیں اس کو دیکھ کر تو ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ شاید بڑے آستانوں کے حاجب و دربان ان کے

ساتھ وہی سلوک نہ کریں جس کی شکایت غالب نے کی ہے کہ

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اسی وجہ سے ہم نے ان کو مشورہ دیا کہ اپنے گوشۂ عزلت میں واپس جائیں اور خدا کے بھروسے پر کام جاری رکھیں، اگر خدا کی بارگاہ میں یہ کام مقبول ہے تو سرمایہ خود ان کے پاس کھنچا چلا آئے گا، البتہ صبر و توکل شرط ہے۔

اسلامی ہند ابھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوا ہے جو تنہا اس کام کا پورا بار سنبھالنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ اگر ایک مالدار شخص کا دیوالہ نکل گیا تو سینکڑوں دوسرے مالدار لوگ بھی موجود ہیں۔ اگر کوئی ایک شخص یہ ہمت نہیں رکھتا تو دس پانچ دولت مند مل کر یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں کمی دراصل روپے کی نہیں بلکہ روپے والوں میں جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ کی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کس کو دیں، مخلص کام کرنے والے ہی نہیں ملتے۔ مگر جب مخلص کام کرنے والوں کا پتہ ان کو دیا جاتا ہے تو ان کے دل سرد ہو جاتے ہیں۔ یہ کام کرنے والا اُن کو سمجھتے ہیں جو پروپیگنڈا کرتے ہیں، مگر ان کو نہیں معلوم کہ جو پروپیگنڈا کرتے ہیں وہ کام نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک کام کرنے والے وہ ہیں جو اپنے سرپرستوں اور مددگاروں کے نام رسالوں اور اخباروں میں اچھالتے ہیں لیکن ان کو نہیں معلوم کہ نام و نمود اور شہرت کے لیے روپیہ دینا اس کو ضائع کرنا ہے۔ اگر فی الحقیقت خدا پر ایمان اور اس کے اجر پر یقین ہے، اور راہ خدا میں کچھ صرف کرنا چاہتے ہو تو ان کو دو جو درحقیقت کچھ کام کرتے ہیں، اور اس طرح دو کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہونے پائے۔

مولٰنا عبدالحمید صاحب نے ٹامیل زبان میں ایک مختصر کتاب بھی لکھی ہے جس کا عنوان "دین الفطرت"

ہے۔ اس میں انہوں نے تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست کے مختلف مسائل پر بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے جتنے قوانین بنائے ہیں وہ کس قدر فطرت انسانی کے مطابق واقع ہوئے ہیں اور کس طرح دنیا صدیوں کے تجربات اور تلخ تجربات کے بعد آخر کار انہی قوانین کی خوشہ چینی پر مجبور ہوئی ہے اور ہوتی جارہی ہے جن پر کبھی وہ تعصب اور جہالت کی وجہ سے اعتراض کیا کرتی تھی۔ یہ کتاب ٹامل زبان میں شائع ہو چکی ہے اور اب وہ انگریزی زبان میں بھی اس کا ترجمہ شائع کرنے والے ہیں۔ ہم نے انگریزی ترجمہ کا مسودہ دیکھا اور اس کو ایک دلچسپ اور مفید چیز پایا۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اس قسم کی کتابیں اگر کثرت کے ساتھ شائع کی جائیں تو ان سے بہت اچھے نتائج حاصل ہونے کی امید ہے۔

اسی زمانے میں ہم کو جناب خلیل انوری صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا جو سنگاپور (جزائر ملایا) سے ایک اعلیٰ درجہ کا انگریزی رسالہ "Genuine Islam" نکالتے ہیں۔ ان کے رسالہ کی تعریف ہم اس سے پہلے ان صفحات میں کر چکے ہیں۔ اپنی شان (Get-up) کے اعتبار سے وہ اس قابل ہے کہ مشرق و مغرب کے بلند پایہ رسائل کے پہلو میں جگہ پا سکتا ہے مضامین کے اعتبار سے بھی خاصا بلند ہے اور زیادہ بلند کیا جا سکتا ہے۔ مگر مشکل یہاں بھی وہی ہے۔ جو دوسرے مفید کاموں کو پیش آرہی ہے خلیل انوری صاحب نے رسالہ اپنے ذاتی سرمایہ سے (جو بہت ہی قلیل تھا) جاری کیا۔ مال دار مسلمانوں میں سے کسی نے ان کا ہاتھ نہ بٹایا تعلیم یافتہ مسلمانوں نے رسالہ خرید کر بھی ان کی اعانت نہ کی۔ ایک بلند پایہ انگریزی رسالہ کو ایسی حالت میں کیونکر چلایا جا سکتا ہے جبکہ اس کے خریدار پورے ایک ہزار بھی نہ ہوں۔ فاضل موصوف سے ہم نے مسلمانوں کی سرد مہری کا جو حال سنا ہے اس سے ہم حیران ہیں کہ یہ قوم آخر کدھر جارہی ہے اور کیا چاہتی ہے۔ اردو میں لٹریچر پیش کیا جائے تو کہتے ہیں ہمیں انگریزی میں چاہیے۔ انگریزی میں پیش

کیا جائے تو اس کو بھی قبول نہیں کرتے۔ اب غالباً چینی اور ٹیکٹوی زبانوں کا مطالبہ ہوگا۔ غیر قومیں ہمارے ممالک میں جو رسالے شائع کرتی ہیں ان کی تعداد اشاعت پچاس پچاس ہزار تک پہنچتی ہے۔ پارسی قوم کا ایک اخبار جو گجراتی میں شائع ہوتا ہے ۶۵ ہزار کی اشاعت رکھتا ہے۔ ہندو قوم کا ایک ماہوار ہندی رسالہ جو ہندی میں نکلتا ہے، چالیس ہزار تک پہنچ چکا ہے۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے بعض اخبارات اور رسالے جو انگریزی زبان میں شائع ہوتے ہیں نصف لاکھ یا اس سے کچھ کم و بیش تک اشاعت حاصل کر چکے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے بہتر سے بہتر اخباروں اور رسالوں کو بھی ہزار دو ہزار —— سے زیادہ اشاعت نصیب نہیں ہوتی۔ چار پانچ ہزار تک جو پہنچ گیا اسے گویا معراج حاصل ہو گئی۔ حوصلوں کا یہ حال ہے اور ان کی ہمسایہ قوموں کے مقابلہ میں سربلند ہونے کی آرزو ہے۔

ہم جن اغراض کے لیے Voice of Islam جاری کرنا چاہتے تھے اور اب تک نہ کر سکے، ان کو Genuine Islam بخوبی پورا کر سکتا ہے۔ مسٹر جلیل انوری ارادہ رکھتے ہیں کہ ترجمان القرآن کے خاص خاص مضامین کو انگریزی زبان میں منتقل کریں۔ ناظرین ترجمان القرآن میں سے جو اصحاب انگریزی زبان پر قدرت رکھتے ہوں وہ بھی ضروری مضامین کے ترجمے بھیج کر ان کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کثرت سے اس رسالہ کو خریدیں اور ایڈیٹر کو اس قابل بنا دیں کہ وہ چین اور جاپان اور جزائر ملایا اور مشرق و مغرب کے دوسرے ممالک میں اس آواز کو پھیلا سکیں۔ ایک وسیع حلقۂ اشاعت کے بغیر کسی بلند پایہ رسالہ کو چلانا اور ایک طاقت ور آرگن بنانا جتنا اردو میں مشکل ہے اس سے بدرجہا زیادہ انگریزی میں مشکل ہے۔

ابھی زیادہ دن نہیں گذرے کہ ہم نے علی گڈھ یونیورسٹی کی تعلیم دینی پر کچھ اظہار خیال کیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس وقت ہمارے بعض خیالات کو لوگوں نے انتہا پسندی پر محمول کیا ہو۔ مگر حال ہی میں "مسلم"

یونیورسٹی کے ایک "مسلم" پروفیسر نے "مذہب" پر توسیعی خطبہ (Extention Lecture) ارشاد فرماتے ہوئے جو گہر افشانی کی ہے وہ غالباً اصحاب ہوش کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہوگی۔ اس خطبہ کی رپورٹ اسٹیٹسمین میں شائع ہوچکی ہے اور اس کے چند فقرے یہ ہیں۔

"انسانی سوسائٹی کے ابتدائی مرحلۂ ارتقا میں وحی بحیثیت ایک اساس مذہب کے نہایت کارآمد تھی کیونکہ اس سے تنقید کا سدباب کیا جاسکتا تھا لیکن حق و صداقت کے حصول کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے وہ صرف یہی نہیں کہ ناقابل اعتبار رہے بلکہ فوق الفطری (Super Natural) ہونے کی وجہ سے جدید انسان کو متاثر کرنے میں ناکام بھی ہوتی ہے۔

"جب مذہبی نظریات کو قانون علّیت (Law of Causality) کے نقطۂ نظر سے جانچا جاتا ہے تو بہت جلدی ان کے پرخچے اڑنے لگتے ہیں۔"

"میرے نزدیک یہ بات واضح ہے کہ اخلاق کو جنت اور دوزخ پر مبنی نہ ہونا چاہیے بلکہ اسے ایک ترقی پذیر سائنس ہونا چاہیے اور عام انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھنا چاہیے"۔

یہ ہے وہ تعلیم جو ہماری یونیورسٹی میں طلبہ کو دی جارہی ہے اور یہ ہیں وہ مرشدان تعلیمی جو علم کے میدان میں ہماری نوخیز نسلوں کی رہنمائی کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔ آپ مسلمان لڑکوں کو خواہ مار مار کر نماز پڑھائیے خواہ نماز نہ پڑھنے پر انھیں رسٹیکیٹ کیجیے، خواہ دینیات لازمہ میں ناکام ہونے پر انہیں امتحانات میں فیل کردیجیے لیکن جہاں ان کے دماغوں میں اس قسم کے خیالات بھرے جاتے ہوں وہاں یہ امید رکھنا کہ نماز ان کے دلوں میں اتر جائے گی اور دینیات پر وہ سچے دل سے ایمان لائیں گے اور اسلام کی کوئی وقعت ان کی نگاہ میں ہوگی، بالکل فضول ہے۔ ہم یہ بات پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور اب پھر کہتے ہیں کہ جس یونیورسٹی میں تمام علوم غیر اسلامی بلکہ اسلام کے مخالف نقطۂ نظر سے پڑھائے جاتے ہوں، اور جہاں دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے پورے ۲۲ گھنٹے طلبہ کو "جدید انسان" بنانے میں

صرف کیے جا رہے ہوں، وہاں ایک چوبیسواں گھنٹہ دینیات کی تعلیم کے لیے رکھنا محض تضیع اوقات ہے۔
دینیات کا ایک کورس بدل کر دوسرا کورس رکھ دیجیے اور آسمان سے کسی فرشتے کو بلا کر اس کے پڑھانے
پر متقرر کیجیے تب بھی نتائج وہی رہیں گے جو اب ہیں۔

پروفیسر صاحب جنہوں نے مذہب پر خطبہ ارشاد فرمایا ہے، غالباً بلکہ یقیناً رشنلسٹ ہی ہوں گے
کیونکہ ہر "جدید انسان" رشنلسٹ ہونے کا مدعی ہے اور اہل مذہب کے مقابلہ میں رشنلزم کا اجارہ اُس
کا پیدائشی حق ہے۔ اب ذرا اُن چند فقروں پر گہری نہ سہی ایک ہلکی سی تنقید (وہی تنقید جس کا وحی
نے سدباب کر دیا تھا) کیجیے جو ان کی زبان مبارک سے خارج ہوئے ہیں۔

آپ کیمسٹری کے معلم ہیں، اور مذہب پر کلام فرما رہے ہیں۔ سب سے پہلے ان سے دریافت کیجیے
کہ آپ نے مذہب کا کتنا مطالعہ فرمایا ہے؟ کون کون سی کتابیں ملاحظہ کی ہیں؟ کتنا وقت مذہبی مسائل
پر غور و خوض کرنے میں صرف کیا ہے؟ اگر ان کے اخلاق (جنت دوزخ والے نہیں بلکہ ترقی پذیر اخلاق)
میں صداقت کوئی چیز ہے تو وہ خود ہی اُس بات کا اعتراف کر لیں گے جو ہم نے ان کا خطبہ پڑھ کر اخذ کی
ہے، یعنی یہ کہ انہوں نے مذہب کا کچھ بھی مطالعہ نہیں کیا، صرف چند ایسے تنقیدی مضامین پڑھے ہیں جو
بعض مغربی مصنفین نے زیادہ تر عیسائی مذہب کو پیش نظر رکھ کر لکھے ہیں، اور اس خارجی و سرسری
مطالعہ پر بھی تفکر اور محققانہ غور و خوض کے لیے ان کو کچھ زیادہ وقت نہیں ملا ہے۔ اس کے بعد کس نے
کہا تھا کہ آپ مذہب پر اظہار رائے فرمائیں؟ کیا ایک رشنلسٹ کا یہی کام ہے کہ وہ کسی ایسے مسئلہ پر اظہار
خیال کرے جس پر اس نے کافی مطالعہ اور کافی غور و خوض نہ کیا ہو؟

آپ کا اسم گرامی حیدر خاں ہے، مسلمانوں کا سا نام۔ غالباً کوئی بھی یہ نام سن کر نہیں کہہ سکتا کہ
آپ مسلمان نہیں ہیں۔ اس نام سے موسوم ہوتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ "حق و صداقت کے حصول کا
ذریعہ ہونے کی حیثیت سے وحی ناقابل اعتبار ہے" اس سے زیادہ صریح الفاظ میں قرآن اور رسالت

کی تکذیب اور کوئی نہیں ہوسکتی، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ بیک وقت مسلمان بھی ہونا اور قرآن و رسالت کی تکذیب بھی کرنا اجتماع ضدین ہے۔ اب اگر آپ خود بھی اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں تو ریشنلسٹ ہونا تو درکنار کوئی صاحب عقل یہ بھی تسلیم نہ کرے گا کہ آپ کے کاسہ سر میں دماغ موجود ہے۔ اور اگر آپ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ اعتقاد قبول کرنے کے ساتھ ہی آپ اسلام سے خارج ہو گئے، تو آپ کو سب سے پہلے اپنے خارج از اسلام ہونے کا اعلان کرنا چاہیے تھا، اور اپنا وہ اسم گرامی بدلنا چاہیے تھا جس کی وجہ سے عرف عام کی بنا پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ ریشنلزم کے اخلاق یعنی ترقی پذیر سائنس میں منافقت اور دھوکہ بازی تو شاید ابھی جائز نہ ہوئی ہوگی

آپ وحی کے متعلق اظہار رائے فرماتے ہیں، مگر یہ متعین نہیں کرتے کہ وحی سے آپ کی مراد کیا ہے؟ حدود متعین کرنے سے پہلے ایک مبہم چیز پر اظہار رائے کرنا کسی ریشنلسٹ کا کام نہیں ہوسکتا۔ ایسا ہی بلکہ اس سے زیادہ مبہم لفظ فوق الفطری ہے جس سے آپ نے وحی کی تعریف کی ہے۔ فاضل متعلم کیسا اگر بولنے سے پہلے یہ تحقیق فرما لیتے کہ اسلام میں وحی کا مفہوم کیا ہے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اس وحی کو تنقید کا سدباب کرنے کے لیے کبھی نازل نہیں کیا گیا بلکہ اس نے تنقید کو خود دعوت دی ہے اور اسی کی بدولت "جدید انسان" دور تنقید میں داخل ہوا ہے۔ نیز اگر وہ "لفظ فوق الفطری" کے حدود متعین کرتے تو یہ تحقیق کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ ایک معنی میں تو وحی فوق الفطری ہی نہیں ہے، اور دوسرے معنی میں اگر ہے بھی تو عقل اور تجربے اور مشاہدے کے ذریعہ سے اس کی صداقت جانچی جاسکتی ہے لہذا "جدید انسان" کا اس سے متاثر نہ ہونا اس کے غیر حق ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ "جدید انسان" "عقل اور سائنٹفک سپرٹ سے" اب تک عاری ہے اور اس پر ابھی تک تعصب اور نفرت کے ان جذبات کا غلبہ ہے جو گذشتہ چار پانچ صدیوں میں معرکۂ مذہب و سائنس سے در اصل مسیحی پادریوں کے خلاف پیدا ہوئے اور پھر ہر اس چیز کے خلاف پھیل گئے جو مذہب کی طرف کسی طرح کی نسبت رکھتی ہو۔ اگر "جدید انسان" متعصب نہ ہوتا اور کھلے دل کے ساتھ ایک سائنٹسٹ کی طرح وحی کی جانچ کرتا تو ہرگز وہ خیالات ظاہر نہ کرتا جو اس نے ظاہر کیے ہیں، اور وحی اس کو متاثر کرنے میں کبھی ناکام نہ ہوتی

ایک ریشنلسٹ کا مقام تو بہت اونچا ہے، اس سے ادنیٰ درجہ میں بھی جس کو عقل سے کچھ بہرہ ملا ہو وہ اتنی معمولی بات تو

ضرور سمجھ سکتا ہے کہ جب کسی چیز کو دیکھنے اور جانچنے سے پہلے اس کے متعلق مخالفانہ رائے قائم کر لی جائے تو وہ آدمی کو متاثر کرنے میں خواہ مخواہ ناکام ہو گی، اور اس کا ناکام ہونا خود اس کے کسی قصور پر مبنی نہ ہوگا بلکہ قصور اس آدمی کا ہوگا جس نے پہلے ہی سے اپنے دل کے دروازے بند کر لیے۔

فاضل پروفیسر نے اُن مذہبی نظریات کی کچھ بھی تشریح نہیں فرمائی جو قانون علیت کے نقطۂ نظر سے جانچ کے پہلے ہی حملہ پر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ مذہبی نظریات غیر اسلامی ہیں تو خواہ وہ پاش پاش ہوں یا نہ ہوں ہمیں ان سے کچھ مطلب نہیں اور اگر وہ اسلامی نظریات ہیں تو براہ کرم وہ ایک ہی نظریہ کو لیکر قانون علیت کے نقطۂ نظر سے جانچیں اور ہم کو بتائیں کہ کس طرح اس کے پرخچے اڑتے ہیں ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ تفصیل میں جانے کی جرأت نہ کریں گے، لیکن اگر وہ کافی ہوشیار نہیں ہیں اور انہوں نے ایسی جرأت کی تو بہت جلدی یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ان کو یا تو مذہبی نظریات کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں، یا وہ قانون علیت کے متعلق بہت کچھ غلط فہمی میں ہیں علیگڈھ میں ترجمان القرآن کے متعدد ناظرین موجود ہیں۔ اگر وہ پروفیسر صاحب کو اپنے مدعا کی توضیح پر آمادہ کر سکیں تو ہم ان کے شکر گذار ہوں گے۔

"اخلاق کو جنت اور دوزخ پر مبنی نہ ہونا چاہیے"۔ بالکل درست۔ مگر یہ کس نے آپ سے کہدیا کہ اسلام میں اخلاق جنت اور دوزخ پر مبنی ہے؟ جنت اور دوزخ اخلاق کے آخری نتائج ہیں نہ کہ اس کی اساس۔ اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ چوری کرو گے تو جیل جاؤ گے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ چوری کا ایک بُرا فعل ہونا جیل پر مبنی ہے؟ یا اگر کسی کو یہ خبر دی جائے کہ سچ بولو گے تو تم کو عزت کا مقام دیا جائے گا، تو کیا اس سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ صداقت کی اساس مقام عزت ہے؟ جن لوگوں کی معلومات اس قدر سطحی ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ وہ مذہب پر خطبہ دینے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ فاضل خطیب نے اگر قرآن کا مطالعہ کیا ہوتا تو ان کو معلوم ہوتا کہ وہ خیر و شر کا ایک ایسا نظریہ پیش کرتا ہے جس کی بلندیوں تک ان کے ائمۂ فرنگ کے دماغوں کی رسائی نہیں ہوئی۔ وہ خیر کو "معروف" کے نام سے موسوم کرتا ہے اور شر کو "منکر" کہتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ نیکی اور بدی کی اساس انسانی فطرت پر قائم ہے فطرت کے مطابق ٹھیک ٹھیک چلنے کا نام نیکی ہے اور اس کا

نجام یہ ہے کہ انسان ترقی کرکے اس مرتبے پر پہنچ جائے جہاں سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو اور کوئی چیز اسکی مرضی کے خلاف نہ ہو، لکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون۔ اور فطرت کے خلاف عمل کرنیکا نام بدی ہے اور اس کا انجام یہ ہے کہ انسان مقام انسانیت سے گرجائے اور تنزل کے اُس مرتبہ پر پہنچ جائے جہاں سب کچھ اسکی مرضی کے خلاف ہو اور کچھ بھی اس کے لیے مرغوب اور پسندیدہ نہ ہو۔

یہ بات اگر فاضل پروفیسر کو معلوم ہوتی تو وہ کبھی یہ نہ کہتے کہ "اخلاق کو ایک ترقی پذیر سائنس ہونا چاہیے اور عام انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھنا چاہیے" حکمت اخلاق کے اس بلند مرتبے پر پہنچنے کے بعد پروفیسر صاحب کو خود محسوس ہوجاتا کہ یہ اخلاقی نظریہ جس کو وہ بہت بلند سمجھ کر پیش فرما رہے ہیں کس قدر پست ہے۔ آپ اخلاق کو ناپائدار بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی رائے میں اساس اخلاق کا استحکام اس کا عیب ہے، اور اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ جنتری کے ساتھ دن بدلتا چلا جائے۔ آپ کا مطلب غالباً یہی ہے کہ کل جو چیز نیکی تھی ضرور نہیں کہ وہی آج بھی نیکی ہو، اور کل جو بدی تھی اس کو آج بھی بدی سمجھنا جمود اور تاریک خیالی ہے۔ انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاق کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ کل تک انسان جن باتوں کو انتہائی بداخلاقی سمجھتا تھا، آج اس کو وہی باتیں فخریہ برسرعام کرنی چاہئیں، اور کل جن افعال کو وہ نیکی سمجھتا تھا آج انہیں حماقت اور دقیانوسیت سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اخلاقی معراج کی یہ وہ انتہائی بلندی ہے جس تک ایک مادہ پرست انسان کا تصور پہنچ سکتا ہے۔ اس کے اخلاق کی بنیاد درحقیقت ہوائے نفس اور خواہشات و جذبات اور لذت پرستی و منفعت طلبی پر ہوتی ہے اور اس کی تائید میں وہ علمی انکشافات اور فکری ارتقاء اور تخیلات کے تحول و انقلاب اور مادی وسائل کی ترقی سے مدد لیتا ہے اس لیے لامحالہ اس کے اخلاق کو "ایک ترقی پذیر سائنس" ہی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ حیوانیت کا مقام ہے انسانیت کا تقاضا ہے کہ اخلاق کی اساس فطرت انسانی پر ہو، اور فطرت چونکہ ایک غیر متبدل شے ہے اس لیے فطری اخلاق کی اساس بھی غیر متبدل اور غایت درجہ مستحکم ہونی چاہیے۔ تغیرات احوال اور ترقیات علمی و عقلی سے اس کے مظاہر بدل سکتے ہیں۔ اس کے مواقع میں تغیر آسکتا ہے۔ اس کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں، مگر اس کی بنیاد اپنی جگہ سے نہیں ٹل سکتی۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

مقالات

تغیرِ احکام بلحاظ تغیرِ ازمنہ و احوال

از افادات علامہ ابن القیم رحمہ اللہ

[اس اشاعت میں ہم علامہ ابن القیم کا ایک اور مقالہ ان کی کتاب "اعلام الموقعین" سے نقل کرتے ہیں۔ اس مقالہ میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ زمان و مکان اور حالات و نیات اور عوائد کے بدل جانے سے احکام شرعیہ میں کس طرح اور کن اصول پر تغیر ہوتا ہے۔ جو لوگ شریعت میں فقیہانہ بصیرت پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے یہ مقالہ غایت درجہ مفید ہوگا]

یہ ایک نہایت نافع بحث ہے جس سے ناواقف ہونے کی بدولت مسائل شرعیہ میں بڑی غلطیاں کی جاتی ہیں، اور حرج و مشقت میں لوگ مبتلا ہوتے ہیں، اور ایسی تکلیفات میں ڈالدیے جاتے ہیں جن سے رستگاری کی کوئی سبیل نہیں ہوتی، حالانکہ یہ معلوم ہے کہ شریعت باہرہ جو مصالح کے بلند ترین مراتب پر ہے، ایسی تکلیف بندوں پر عائد نہیں کرتی۔ شریعت کی بنیاد تو حکمت پر ہے۔ وہ معاش اور معاد دونوں میں بندوں کے مصالح کی پوری رعایت کرتی ہے۔ وہ سراسر عدل ہے، سراسر رحمت اور مصلحت اور حکمت ہے۔ ہر وہ مسئلہ جو عدل سے نکل کر جَور تک پہنچ جائے، اور رحمت سے خارج ہو کر زحمت بن جائے، اور مصلحت کے بجائے مفسدہ کی طرف رجوع کرے، اور حکمت کے مقام سے نکل کر عبث ہو جائے، وہ شریعت کا مسئلہ نہیں ہے۔ خواہ کیسی ہی تاویل سے اس کو شریعت میں داخل کیا جائے۔ شریعت دراصل اللہ کا عدل ہے اس کے بندوں کے درمیان، اور اس کی رحمت ہے اس کی مخلوق کے درمیان، اور اس کا سایہ ہے اس کی زمین پر اور اس کی حکمت ہے جو اس پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر سچی اور مکمل

دلالت کرتی ہے۔ وہ اس کا نور ہے جس سے آنکھوں والوں نے دیکھا ہے اور اس کی ہدایت ہے جس سے ہدایت پانے والوں نے راہ راست پائی ہے، اور اس کی شفاء تام ہے جو ہر علیل کی دوا ہے، اور اس کی ایسی راہ مستقیم ہے کہ اُس پر جو ثابت قدم ہوگیا وہ سلامتی کی راہ پر جم گیا وہ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دلوں کی زندگی اور روحوں کی لذّت ہے حیات اور غذا اور دوا اور نور اور شفاء اور عصمت سب کچھ اسی سے ہے۔ وجود میں جو کچھ خیر ہے وہ اسی سے مستفاد ہے اور اسی سے حاصل ہوتا ہے، اور وجود میں جو کچھ نقص ہے وہ اسی کو ضائع کردینے کا نتیجہ ہے۔ اگر اس کے کچھ آثار باقی نہ رہ جاتے تو دنیا تباہ ہوجاتی اور عالم کا سارا دفتر لپیٹ دیا جاتا۔ وہی در اصل قوامِ عالم اور انسان کے لیے پشت پناہ ہے۔ اسی سے اللہ آسمانوں اور زمینوں کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ دنیا کی خرابی کا ارادہ فرمائے گا اور دنیا کے دفتر کو لپیٹ دینا چاہے گا تو اس کے جو آثار باقی ہیں ان سب کو اٹھالے گا۔ پس وہ شریعت جس کو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ سے بھیجا ہے، عمودِ عالم ہے، قطب فلاح ہے۔ دنیا اور آخرت کی سعادت ہے۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ ازمنہ و امکنہ اور احوال و نیّات اور عوائد کے تغیر سے فتویٰ میں کس طرح تغیر ہوتا ہے اور ان کے اختلاف کے لحاظ سے احکام میں کس طرح اختلاف ہوجاتا ہے۔ اس مضمون کو ہم چند صحیح مثالوں سے واضح کریں گے۔

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے ایجاباً یہ لازم کیا ہے کہ مُنکَر (بدی) کی مخالفت کریں اور اس کو مٹائیں تاکہ اِس مخالفت اور انکار سے وہ معروف حاصل ہو جس کو اللہ اور اس کا رسول پسند کرتا ہے۔ لیکن اگر کسی بدی کی مخالفت سے کوئی ایسی بدی حاصل ہوتی ہو جو اس سے زیادہ بدتر ہو اور خدا اور رسول کو اس سے بھی زیادہ ناپسند ہو تو اس کی مخالفت میں کوشش کرنا مناسب نہیں، اگرچہ وہ اللہ کے نزدیک مبغوض ہے اور اللہ اس کے حامیوں اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو ناپسند کرتا

ہے۔ مثال کے طور پر جابر و ظالم بادشاہوں اور بدکار امرا پر خروج کرنا کہ یہ ہر فتنہ اور شر کی جڑ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے پوچھا کہ جو امرا نماز کو اس کے وقت سے ٹال دیں، کیا ہم کو ان سے جنگ نہ کرنی چاہیے۔ فرمایا "نہیں، جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں"۔ ایک حدیث میں ہے کہ "جو کوئی اپنے امیر سے کوئی برائی دیکھے وہ اس پر صبر کرے اور اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے"۔ اگر تم ان فتنوں پر غور کرو جو اسلام میں برپا ہوئے ہیں تو تم کو معلوم ہوگا کہ وہ اسی اصل کو ضائع کر دینے کا نتیجہ ہیں۔ منکر پر صبر نہ کیا گیا اور اس کو زائل کر دینے کی کوشش کی گئی۔ اس سے وہ منکر پیدا ہوا جو اس سے عظیم تر تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بڑے بڑے منکرات دیکھتے تھے مگر ان کو مٹا دینے پر قادر نہ تھے اس لیے خاموش رہ جاتے تھے۔ یہی نہیں، بلکہ جب اللہ نے مکہ کو فتح کر دیا اور وہ دارالاسلام بن گیا اس وقت حضور خانۂ کعبہ میں ترمیم کرنا اور اسے بنائے ابراہیمی پر قائم فرمانا چاہتے تھے مگر قدرت رکھنے کے باوجود آپ اس لیے باز رہے کہ اس کام کے نہ کرنے میں جو خرابی تھی اس سے عظیم تر خرابی کا اندیشہ اس کے کرنے میں تھا، یعنی یہ کہ اہل قریش جو اس وقت جدید الاسلام تھے اور جن کو کفر سے نکلے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا، شاید اس کو برداشت نہ کر سکیں۔ اسی بنیاد پر حضور نے امراء کے خلاف بھی عملی کارروائی کرنے کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس سے ایسی خرابیاں واقع ہونے کا اندیشہ ہے جو ان کے شر سے عظیم تر ہوں۔

انکار منکر کے چار درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ منکر کو زائل کر کے اس کی جگہ معروف کو قائم کر دیا جائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ منکر کو بالکلیہ زائل نہ کیا جا سکے تاہم اس کو گھٹا دیا جائے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ ایک منکر کو اس طرح مٹایا جائے کہ ویسا ہی دوسرا منکر اس کی جگہ قائم ہو جائے۔ اور چوتھا درجہ یہ ہے کہ ایک منکر کو مٹانے کی کوشش میں اس سے بدتر منکر قائم ہو جائے۔

ان میں سے پہلے دونوں درجے تو مشروع ہیں اور جب ان دونوں میں سے کسی کی امید ہو تو

انکارِ منکر ضرور کرنا چاہیے۔ تیسرے درجہ میں اجتہاد کا موقع ہے۔ رہا چوتھا درجہ تو وہ ممنوع ہے بمثال کے طور پر اگر تم دیکھو کہ اہل فجور و فسوق شطرنج کھیل رہے ہیں تو ان کو محض زجر و توبیخ کرنا حکمت اور بصیرت کے خلاف ہوگا۔ عقلمندی یہ ہے کہ ان کو ایسے کھیل میں لگاؤ جو خدا اور رسول کو پسند ہے مثلاً تیراندازی اور گھوڑ دوڑ وغیرہ۔ ایک جگہ تم دیکھتے ہو کہ فساق کا مجمع ہے اور لہو و لعب ہو رہا ہے یا رقص و سرود کی محفل گرم ہے۔ اگر تم ان کو کسی تدبیر سے عبادت یا فعل خیر کی طرف منتقل کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔ لیکن اگر ان کو منتشر کر دینے کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ اس سے بدتر کاموں کے لیے فارغ ہو جائیں تو اُن کو اسی چھوٹے درجہ کے فسق میں مبتلا رہنے دینا زیادہ بہتر ہے کہ وہ چھوٹی بُرائی ہی اُن کو بڑی برائی سے روکے ہوئے ہے۔ ایک شخص کو تم دیکھتے ہو کہ افسانہ و مزاح کی کتابیں پڑھ رہا ہے۔ اگر اس کو ایسی چیزوں کے مطالعہ سے منع کرنے کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ بدعت اور گمراہی اور سحر کی کتابیں پڑھنے لگے تو اس کو افسانہ و مزاح ہی میں چھوڑ دینا اولیٰ ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس اللہ روحہٗ و نوّر ضریحہٗ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ فتنۂ تاتار کے زمانے میں میرا گذر تاتاریوں کے ایک گروہ پر ہوا جو شراب نوشی میں مشغول تھا۔ میرے ساتھیوں نے ان کو ملامت کرنی شروع کی مگر میں نے ان کو روک دیا اور ان سے کہا کہ اللہ نے شراب سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ وہ ذکر اللہ اور نماز سے روکتی ہے۔ مگر یہاں شراب ان کو قتل نفوس اور نہب اموال اور ظلم و ستم سے روکے ہوئے ہے' لہٰذا ان کو ان کے حال ہی پر چھوڑ دو۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے موقع پر سارق کا ہاتھ کاٹنے سے منع فرما دیا (رواہ ابوداؤد) غور کرو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوی حدوں میں سے ایک حد ہے۔ مگر جنگ میں آپ نے اس کو قائم کرنے سے روک دیا، اسی خوف سے تاکہ اس کے نتیجہ میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو خدا کے نزدیک حدود اللہ کی تعطیل و تاخیر سے زیادہ مبغوض ہو، مثلاً مجرم کا بھاگ کر دشمنوں سے جا ملنا جیسا کہ حضرات عمر اور

ابو درداء اور حذیفہ وغیرہم نے فرمایا ہے ۔ اسی بناء پر امام احمد اور اسحاق بن راہویہ اور اوزاعی وغیرہ علمائے اسلام نے کہا ہے کہ دشمن کی سرزمین پر حدود جاری نہ کئے جائیں ۔ ابو القاسم خرقی اپنی مختصر میں لکھتے ہیں کہ کسی مسلمان پر دشمن کی سرزمین میں حد جاری نہ کی جائے ۔ ایک جنگ کے موقع پر حضرت بسر بن ارطاۃ کے پاس ایک شخص پکڑا ہوا آیا جو ان کی ڈھال چرالے گیا تھا ۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہ سنا ہوتا کہ جنگ میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں تو میں تیرا ہاتھ ضرور کاٹ دیتا (رواہ ابوداود) ابو محمد مقدسی کہتے ہیں کہ اسی پر صحابہ کا اجماع ہے ۔ اور سعید بن منصور اپنی سنن میں احوص بن حکیم سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے یہ فرمان لکھ کر بھیج دیا تھا کہ کسی لشکر اور سریہ کے امیر پر یا مسلمانوں میں سے کسی شخص پر حالت جنگ میں حد نہ جاری کی جائے تاوقتیکہ وہ سرحدوں کو عبور کر کے اپنے علاقہ میں نہ آجائے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر حمیت شیطانی کا غلبہ ہو جائے اور وہ کفار سے جا ملے ۔ ابو الدرداء سے بھی ایسا ہی منقول ہے ۔ اور علقمہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم ایک لشکر کے ساتھ روم کی سرزمین میں پڑے ہوئے تھے حذیفہ بن الیمان بھی ہماری جماعت میں تھے ۔ اور ولید بن عقبہ ہمارے سردار تھے ۔ اتفاق یہ ہوا کہ ولید شراب پی گئے ۔ ہم نے ارادہ کیا کہ حد جاری کریں ۔ حذیفہ نے ہم کو روکا اور کہا کہ تم اپنے سردار لشکر پر حد جاری کرتے ہو ، حالانکہ دشمن تمہارے قریب موجود ہے ؟ قادسیہ کی جنگ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے پاس ابو محجن ثقفی جرم بادہ خواری میں گرفتار ہو کر آئے اور آپ نے انہیں قید کر دیا جب معرکۂ کارزار گرم ہوا تو ابو محجن بڑی حسرت کے ساتھ یہ شعر پڑھنے لگے ۔

کفی حزنا ان تطرد الخیل بالقنا واترک مشدودا علی وثاقیا

کیسے رنج کا مقام ہے کہ شہسوار تو نیزوں کے ہاتھ دکھا رہے ہوں اور میں یہاں بندھا پڑا ہوں

آخرکار انہوں نے حضرت سعد کی بیوی سے کہا کہ آپ مجھے چھوڑ دیجیے اور میں خدا کی قسم کھا کر

آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر جی بچا تو واپس آکر خود بیڑیاں اپنے پاؤں میں ڈال لوں گا۔ اور اگر مارا گیا تو جھگڑا ہی چکتا ہو جائے گا۔ یہ بات انہوں نے مان لی اور ابو محجن چھوٹ کر غازیوں سے جا ملے سعد اس روز زخم کی وجہ سے میدان جنگ میں نہ آسکے تھے اور لوگوں نے ان کو ایک بلند جگہ پر بٹھا دیا تھا کہ جنگی نقل و حرکت کو دیکھتے رہیں۔ فوج کی قیادت ان کے نائب کی حیثیت سے خالد بن عرفطہ کر رہے تھے۔ ابو محجن جو چھوٹ کر نکلے تو انہوں نے حضرت سعد کی گھوڑی بلقاء پر قبضہ کیا اور نیزہ ہاتھ میں لیکر معرکۂ کارزار میں جا گھسے۔ حال یہ تھا کہ جدھر حملہ کرتے تھے دشمنوں کی صفیں پلٹ دیتے تھے۔ ان کے حیرت انگیز کارناموں کو دیکھ کر لوگوں میں یہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ یہ شائد کوئی فرشتہ ہے جو مسلمانوں کی مدد کے لیے آگیا ہے۔ اوپر سعد حیرت کے ساتھ بار بار کہتے تھے کہ جانور کی جانفشانی بتا رہی ہے کہ بلقاء ہے۔ اور سوار کی جلت پھرت کہتی ہے کہ ابو محجن، مگر ابو محجن تو قید میں ہے۔ پھر آخر یہ ہے کون؟ جب لڑائی ختم ہوگئی اور دشمن بھاگ گئے تو ابو محجن نے آکر وعدے کے مطابق خود بیڑیاں پہن لیں۔ سعد کی بیوی نے اپنے شوہر سے سارا واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم میں ایسے شخص کو تو نہیں ماروں گا جس نے آج مسلمانوں کے لیے ایسی جان نثاری کی ہے۔ چنانچہ ابو محجن چھوڑ دیے گئے۔ جب ان کو رہائی کا حکم ملا تو انہوں نے کہا کہ میں نے تو شراب اس امید پر پی تھی کہ مجھ پر حد جاری کی جائے گی اور مجھے پاک کر دیا جائے گا۔ مگر تم نے مجھے پاک کیے بغیر ہی چھوڑ دیا تو اب میں کبھی شراب نہ پیوں گا۔

اس میں کوئی بات بھی نص یا قیاس یا قواعد شرع میں سے کسی قاعدے کے خلاف نہیں ہے نہ اجماع کے خلاف ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اسی پر صحابہ کا اجماع ہے تو زیادہ درست ہوگا، چنانچہ شیخ اپنی کتاب المغنی میں فرماتے ہیں کہ اس پر اتفاق ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ کسی نے اس سے اختلاف کیا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اقامت حد میں یہ تاخیر دو مصلحتوں میں سے کسی ایک مصلحت پر مبنی ہے۔ یا تو اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ مسلمانوں کو ایک جنگ آزما سپاہی کی خدمات حاصل ہونگی، یا کم از کم یہ خطرہ تو نہ رہے گا کہ ملزم

مرتد ہو کر کفار سے جا ملے۔ رہی یہ بات کہ آیا کسی عارضی امر کی وجہ سے اقامتِ حد میں تاخیر کرنا جائز ہے یا نہیں، تو شریعت میں اس کے جواز کی دوسری مثالیں بھی موجود ہیں، مثلاً حاملہ عورت پر حد کی اقامت ملتوی کر دی جاتی ہے جس کا بچہ دودھ پیتا ہو۔ سخت گرمی اور سخت سردی کے وقت بھی حد جاری نہیں کی جاتی مریض پر حالتِ مرض میں بھی اقامتِ حد ممنوع ہے۔ پس جب مجرموں کے مصالح کو پیش نظر رکھ کر حد ملتوی کرنا جائز ہے تو اسلام کی مصلحت کے لیے ملتوی کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔

سعد بن ابی وقاص نے ابو محجن کے ساتھ جو کچھ کیا اس سے ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے ابو محجن پر سے حد ملتوی نہیں کی بلکہ ساقط ہی کر دی۔ کیا یہ اسقاط جائز ہے؟ ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ جائز ہے، چنانچہ ان کا مذہب یہ ہے کہ دارالحرب میں مسلم پر حد نہیں ہے۔ اور انہوں نے حضرت سعد کے اسی فعل سے تمسک کیا ہے مگر میرے نزدیک حضرت سعد کے اس فعل میں کوئی ایسی حجت نہیں ہے کہ اس کی بنا پر اسقاط حد کا عام قاعدہ بنا لیا جائے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعد رضی اللہ عنہ نے اس معاملہ میں سنت اللہ کی پیروی کی ہے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ابو محجن نے دین کے لیے ایسی فداکاری کی ہے اور اللہ کے لیے کمال درجہ کا جہاد اور بذل نفس کیا ہے تو حد ان پر سے ساقط کر دی، کیونکہ ان کی نیکی ان کے اس گناہ پر چھا گئی اور وہ اس طرح نیکی میں محو ہو گیا جیسے سمندر میں نجاست کا ایک قطرہ محو ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ حضرت سعد نے یہ بھی خیال کیا ہوگا کہ ابو محجن نے جنگ کے موقع پر ضرور سچے دل سے توبہ کر لی ہوگی، اس لیے کہ کسی مسلمان کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے کڑے وقت میں جب کہ موت سامنے ہو اور ہر وقت خدا کے پاس حاضر ہو جانے کا امکان ہو، وہ گناہ پر اصرار کرے گا۔ پھر جس طرح ابو محجن نے اپنے آپ کو خود لا کر قید کے لیے پیش کر دیا اور بیڑیاں پہن لیں، اس سے وہ اس بات کے مستحق ہو گئے تھے کہ ان کی حد معاف کر دی جائے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس قسم کی رعایت ثابت ہے۔ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں حد کا مستحق ہو گیا ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائی جائے۔ حضور نے فرمایا کیا

تو نے اس وقت ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟ اس نے عرض کیا جی ہاں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا جا اللہ نے تیری حد معاف کر دی۔ اور اس معافی اور اسقاطِ حد کی برکت اس طرح ظاہر ہوئی کہ اس نے اسی وقت سچے دل سے توبہ کر لی، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ اس نے کہا اب میں کبھی شراب نہ پیوں گا۔ دوسری روایت میں ابدالآباد کے الفاظ ہیں۔ تیسری روایت میں اس کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ "تمہارے کوڑوں کے خوف سے شراب چھوڑنا مجھے گوارا نہ تھا مگر اب کہ تم نے مجھے چھوڑ دیا، خدا کی قسم اب میں کبھی شراب نہ پیوں گا۔ اسی طرح حضرت خالد نے بنی جذیمہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ ایسا فعل تھا کہ حضور نے اس سے براءت کا اظہار فرمایا، مگر اس پر کوئی مواخذہ ان سے نہ کیا، کیونکہ خالد کی خدمات اور اسلام پر ان کی جان نثاریوں کا لحاظ تھا۔ اور جو کوئی امر نہی اور ثواب و عقاب کی مطابقت اور ان کے باہمی ارتباط کو نظر تامل سے دیکھے گا اس پر اس باب میں تفقہ کا دروازہ کھل جائیگا جس طرح اللہ تعالیٰ کسی تائب کو عذاب نہیں دیتا، اسی طرح تائب پر حد بھی نہیں قائم کی جاتی۔ چنانچہ خود اللہ ہی نے ان محاربین پر سے حد ساقط کر دی جو مسلمانوں کے قبضۂ قدرت میں آنے سے پہلے توبہ کر چکے ہوں۔ ایسے زبردست جرم کے مجرموں پر سے جب حد ساقط کر دی گئی تو اس سے ادنیٰ درجہ کے جرائم پر تو بھی توبہ سے بدرجہ اولیٰ حد ساقط ہونی چاہیے۔ سنن نسائی میں ایک حدیث آئی ہے جس کو سماک نے علقمہ بن وائل سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت صبح اندھیرے منہ نکل کر مسجد جا رہی تھی کہ ایک شخص نے اس کو پکڑ لیا اور زبردستی زنا کرنے لگا۔ عورت نے شور مچانا شروع کیا۔ پاس سے ایک شخص گذر رہا تھا۔ وہ جب آیا تو مجرم بھاگ گیا۔ یہ شخص اس کو پکڑنے کے لیے دوڑا، اتنے میں اور لوگ آگئے اور عورت نے ان سے فریاد کی۔ وہ بھی مجرم کو پکڑنے کے لیے دوڑے۔ اصل مجرم تو بھاگ نکلا اور وہ شخص جو اس کو پکڑنے کے لیے بھاگا جا رہا تھا ان لوگوں کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ اس کو پکڑ کر عورت کے پاس لائے۔ اس نے کہا کہ میں تو اس کی مدد کے لیے آیا تھا۔ اور وہ شخص جس نے اس پر دست درازی کی تھی بھاگ گیا ہے۔ مگر کسی نے اس کی نہ سنی اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا

عورت نے حضور سے عرض کیا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ لوگوں نے بھی کہا کہ ہم نے اسے بھاگتے ہوئے پکڑا تھا اس نے کہا کہ میں اس کی مدد کے لیے آیا تھا اور مجرم کو پکڑنے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ ان لوگوں نے راستہ میں مجھے دوڑتے ہوئے پایا اور پکڑ لیا۔ عورت نے کہا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے۔ دراصل اسی نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ آخر کار حضور نے فیصلہ فرمایا کہ لے جاؤ اسے اور رجم کرو۔ جب اس کو رجم کرنے کا وقت آیا تو مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا کہ اس کو رجم نہ کرو۔ رجم کا سزاوار تو میں ہوں میں نے ہی عورت پر حملہ کیا تھا۔ اس پر تینوں کو دوبارہ حضور کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ اقراری مجرم اور وہ شخص جو عورت کی مدد کو آیا تھا، اور خود عورت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا معاملہ سن کر اس شخص کے حق میں کلمات خیر فرمائے جس نے عورت کی مدد کی تھی۔ اور اقراری مجرم سے فرمایا کہ تجھے معاف کر دیا گیا۔ حضرت عمر نے عرض کیا کہ جس نے زنا کا اعتراف کر لیا ہے اس کو تو رجم فرمائیے۔ حضور نے انکار کیا اور فرمایا کہ اس نے اللہ سے توبہ کر لی ہے۔

اس مقدمہ میں بحمد اللہ کوئی اشکال نہیں ہے۔ اگر کہا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر شہادت اور بغیر اقرار کے پہلے شخص پر رجم کا فیصلہ کیسے صادر فرما دیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور کا یہ فعل اس بات پر نہایت قوی دلیل ہے کہ تہمتوں میں قرائن کا اعتبار کرنا اور شواہد احوال پر رائے قائم کرنا جائز ہے، اور اس کی نظیر یہ ہے کہ شراب نوشی کے جرم میں منہ کی بو اور قے پر اقامت حد کا فیصلہ کیا جاتا ہے جیسا کہ صحابہ کا اجماع ہے۔ اور زنا کے جرم میں حمل کی شہادت کو اقامت حد کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے جیسا کہ حضرت عمر نے فیصلہ کیا ہے۔ اور فقہاء اہل مدینہ کا مذہب ہے۔ اسی طرح جس پر سرقہ کی تہمت ہو اگر اس کے قبضہ سے مال مسروقہ برآمد ہو جائے تو یہ اقامت حد کے لیے کافی شہادت ہے پس یہ شخص جب بھاگتا ہوا پکڑا گیا اور عورت نے کہا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھ سے ایسا کیا تھا، اور خود اس شخص نے بھی کم از کم اتنا اعتراف کیا کہ وہ اس کے پاس آیا ضرور تھا گو اس کے ساتھ اس نے

یہ دعوی بھی کیا کہ بری نیت سے نہیں بلکہ اس کی مدد کے لیے آیا تھا) اور پکڑنے والے لوگوں نے اس کے سوا اور کسی کو دیکھا نہیں تو ایسی صورت میں کوئی اور رائے اس کے سوا قائم ہی نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہی شخص مجرم تھا۔ ان قرائن وشواہد سے جو گمان غالب حاصل ہوتا ہے وہ اس گمان غالب سے کچھ کم نہیں ہے جو شہادت سے حاصل ہوتا ہے۔ شہادت میں بھی غلطی کا احتمال یا گواہوں کی دشمنی کا احتمال ویسا ہی ہے جیسا کہ اس معاملہ میں غلط فہمی یا عورت کی عداوت کا احتمال ہے۔ بلکہ یہاں اس گمان کی بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ عورت نے دشمنی کی بنا پر اس شخص کو متہم کر دیا ہوگا۔ غرض یہ کہ اس مقدمہ میں ظاہری قرائن وشواہد اتنے مضبوط ہیں کہ اس درجہ کے قرائن وشواہد ثبوتِ حد کے لیے شرعاً کافی ہو سکتے ہیں، بلکہ بہت سے مواقع پر اس سے بھی کم درجہ کے قرائن وشواہد کو فیصلہ کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ ایک عمدہ نظیر ہے اور قواعد شرع پر باحسن وجوہ جاری ہوتا ہے۔ ظاہری احکام ہمیشہ ظاہری دلائل مثلاً شہادت اور اقرار اور شواہد احوال کے تابع ہوتے ہیں، اور ان کا کبھی کبھی نفس الامر کے خلاف ہونا کوئی ایسا امر نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ فصل خصومات کے لیے یہ طریقے اور وسائل کافی نہیں ہیں۔ خود شہادت بھی تو بالذات موجب حد نہیں ہے بلکہ حد کے ساتھ اس کا رابطہ وہی ہے جو مدلول کے ساتھ دلیل کا رابطہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی دلیل اس کے خلاف برابر کی قوت رکھتی ہو یا اس سے زیادہ قوی ہو تو شارع کی نگاہ میں وہ ناقابل التفات نہیں ہے اور اس کا نفس الامر کے خلاف ہونا اس کے دلیل ہونے میں اسی طرح قادح نہیں جس طرح شہادت اور اقرار کا حقیقت کے خلاف نکلنا اس کے دلیل ہونے میں قادح نہیں ہے۔

رہا اقراری مجرم سے حد کا اسقاط، تو جب امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جیسے شخص کا دامن عفو اس کے لیے وسیع نہ ہو سکا تو کوئی حرج نہیں اگر اکثر فقہاء کا دامن عفو بھی اس کے لیے وسیع نہ ہو، لیکن رؤف رحیم کا دامن تو اس کے لیے پھیل چکا ہے۔ جب اس نے ایک بے گناہ شخص کو سنگسار

ہوتے دیکھ کر اپنے جرم کا آپ سے آپ اقرار کر لیا اور اپنے آپ کو برضا و رغبت سنگساری کے لیے پیش کر دیا تو حضور نے اس کے اس فعل کو اس امر کی بین دلیل سمجھا کہ اس کے دل میں خدا کا خوف آگیا ہے اور اس نے سچے دل سے اپنے مالک کی طرف رجوع کیا ہے۔ نیز اس کا ایک مسلمان کو ہلاکت سے بچانا، اور اسکی سلامتی کے لیے اپنے آپ کو موت کے سامنے پیش کر دینا ایسی بڑی نیکی تھی جس کے مقابلہ میں زنا کا جرم ہلکا ہو گیا۔ حضور نے سمجھا کہ یہ طاقت ور دوا اس کے مرض کو زائل کر چکی ہے، اور اس کا قلب جو عارضی طور پر جرم کی بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا، پھر صحت کی طرف عود کر آیا ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ ہمیں تجھ پر حد لگانے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے تو حد اسی لیے مقرر کی ہے کہ آدمی کو پاک کر دے۔ اور اس کے مرض کا علاج کر دے مگر جب تو اس کے بغیر ہی پاک اور صالح ہو گیا تو اب تیرا مقام رجم گاہ نہیں بلکہ ہمارا دامن عفو ہے۔ دیکھو! کونسا فیصلہ اس فیصلہ سے بہتر ہو جاتا ہے کہ رحمت کے مطابق بھی ہے اور حکمت و مصلحت کے مطابق بھی۔

سنن نسائی میں اوزاعی کی حدیث ہے جس کو انہوں نے ابو عمار شداد سے اور انہوں نے ابو امامہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہوا اور بولا یا رسول اللہ میں حد کا مستحق ہو گیا ہوں، مجھ پر جاری فرمائیے۔ حضور نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اس نے پھر عرض کیا کہ میں حد کا مستحق ہوں، مجھپر حد جاری فرمائیے۔ آپ نے سنا اور پھر ٹال دیا۔ سہ بارہ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں حد کا مجرم ہوں آپ مجھ پر حد جاری فرمائیں۔ آپ نے پھر سنی ان سنی ایک کر دی۔ اس کے بعد نماز کے لیے جماعت کھڑی ہو گئی۔ جب حضور نے سلام پھیرا تو اس شخص نے پھر آگے بڑھ کر عرض کیا کہ میں مجرم ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے۔ حضور نے پوچھا جب تو یہاں آیا تھا تو کیا تو نے وضو کیا تھا؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے پوچھا کہ جب ہم نے نماز پڑھی تو کیا تو نے بھی نماز پڑھی؟ اس نے کہا ہاں۔ تب حضور نے فرمایا جا۔ اللہ نے تجھے معاف کیا دوسری

روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا اللہ نے تیرا گناہ معاف کیا، یا یہ کہ تیری حد معاف کی۔

نسائی نے اس حدیث پر ترجمۃ الباب باندھا ہے کہ "جس نے حد کا اعتراف کیا اور اس کا نام نہ لیا"۔ اس باب میں لوگوں کے تین مسلک ہیں۔ ایک تو یہی ہے جو نسائی نے لکھا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ بات اس شخص کے لیے خاص تھی۔ اور تیسرا یہ ہے کہ پکڑے جانے سے پہلے جو توبہ کرلے اس پر سے حد ساقط کردی جائے اور یہی صحیح ترین مسلک ہے۔

(۳) حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانے میں سارق کا ہاتھ نہیں کاٹا اور اس پر سے حد ساقط کردی۔ سعدی نے ہارون بن اسمٰعیل الخراز سے اور انہوں نے علی بن المبارک سے اور انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے اور انہوں نے حسان بن زاہر سے اور انہوں نے ابن حدیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ کھجور کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں، اور نہ قحط کے زمانہ میں سرقہ کی حد جاری کی جائے۔ سعدی کہتے ہیں کہ میں نے احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ سے پوچھا، کیا آپ بھی اس کے قائل ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ضرور۔ میں نے پوچھا اگر قحط کے زمانے میں چوری کی جائے تو کیا آپ ہاتھ نہ کاٹیں گے؟ انہوں نے کہا اگر زمانہ خشک سالی کا ہو اور لوگوں پر سختی گذر رہی ہو اور ایسی حالت میں حاجت سے مجبور ہو کر کوئی شخص چوری کرے تو میں کبھی اس کا ہاتھ نہ کاٹوں گا۔

سعدی کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے حاطب کے غلاموں سے جو معاملہ کیا وہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے ہم سے ابو نعمان عارم نے اور ان سے حماد بن سلمہ نے اور ان سے ہشام بن عروہ نے اور ان سے ان کے والد نے اور ان سے خود حاطب کے بیٹے نے بیان کیا کہ حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں نے قبیلۂ مزینہ کے ایک شخص کا اونٹ چرالیا۔ گرفتار ہوئے اور حضرت عمر کی خدمت میں پیش کیے گئے سب نے جرم کا اقرار کرلیا۔ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن بن حاطب کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ دیکھو، حاطب کے غلاموں نے ایک مزنی کا اونٹ چرالیا ہے وہ خود اپنے جرم کے معترف ہیں۔ اس کے بعد حضرت

عمر نے کُثَیر بن الصَّلت سے فرمایا کہ جا اور ان کے ہاتھ کاٹ دے۔ جب وہ ان کو لے کر چلے تو حضرت عمر نے ان کو واپس بلایا اور کہا کہ خدا کی قسم مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ ان بیچاروں سے خدمت لیتے ہو اور پھر انہیں بھوکا مارتے ہو یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی حرام چیز بھی کھائے تو وہ ان کے لیے حلال ہو جائے اگر میں یہ نہ جانتا ہوتا تو ضرور ان کے ہاتھ کاٹ دیتا۔ مگر اب جو میں ان کو معاف کر رہا ہوں تو اس کا تاوان تم پر ڈالوں گا۔ اور ایسا تاوان وصول کروں گا جس سے تم کو قدر و عافیت معلوم ہو گی پھر اس مُزَنی سے پوچھا کہ تیرا اونٹ کس قیمت کا تھا۔ اس نے کہا چار سو درہم کا۔ حضرت عمر نے عبدالرحمٰن بن حاطب سے فرمایا کہ جاؤ اور اس کو آٹھ سو درہم دو۔

امام احمد نے ان دونوں صورتوں میں حضرت عمر سے اتفاق کیا ہے چنانچہ اسماعیل بن سعید الشالنجی کے مسائل میں جن کی شرح سعدی نے المترجم کے نام سے لکھی ہے، یہ مذکور ہے کہ میں نے احمد بن حنبل سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص کسی کے پھل چوری سے توڑے تو کیا سزا دی جائے گی۔ انہوں نے جواب دیا کہ مالک کو دگنی قیمت دلوائی جائے گی، اور چور کو پیٹا جائے گا۔ ہم جس کو حد یا قصاص سے معاف کرتے ہیں اس پر غرامت دوگنی کر دیتے ہیں۔ اسی طرح قحط کے زمانہ میں حد سرقہ کے سقوط پر امام احمد نے اَوزاعی سے اتفاق کیا ہے۔ یہ محض قیاس ہے اور گو شریعت کا صریح حکم یہ نہیں ہے۔ مگر قواعد شرع کا مقتضیٰ یہی ہے۔ کیونکہ جب کال پڑتا ہے تو لوگ عام طور پر مصیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور ایسی حالت میں بعید نہیں ہے کہ کسی شخص نے محض سدّ رمق کی خاطر مجبوراً چوری کی ہو۔ دوسری طرف خود مال کے مالک پر بھی اس حال میں واجب تھا کہ حاجت مند کو وہ مال دیتا، خواہ بقیمت یا مفت (اس باب میں اختلاف ہے اور صحیح یہی ہے کہ مفت دینا واجب ہے اس لیے کہ لوگوں کو ہلاکت سے بچانا اس پر فرض ہے جو اس کی قدرت رکھتا ہو، اور محتاج کی ضرورت اگر شدید ہو تو صاحب فضل پر اشیاء زواجب ہو جاتا ہے) پس قحط سالی کے زمانہ میں چوری کا معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے اور یہ شبہ اتنا قوی ہے کہ

اس کی بنا پر قطعِ ید کی سزا ساقط ہونی چاہیے، بلکہ یہ اُن بہت سے شبہات سے زیادہ قوی ہے جن کو فقہا نے سقوطِ حد کے لیے کافی سمجھا ہے۔ جو شبہات وہ بیان کرتے ہیں اگر تم ان کو اور اس شبہ کو میزان عدل میں تولو گے تو تم کو دونوں کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ مثلاً اگر مال مسروقہ کسی ایسی جنس سے ہو جو جلدی بگڑ جاتی ہو، یا وہ ان چیزوں میں سے ہو جو مباح الاصل ہیں جیسے پانی، یا سارق اس کی ملکیت کا مدعی ہو، اور اسکے پاس کوئی ثبوت نہ ہو یا اس شبہہ کی گنجایش ہو کہ اگر وہ مال مالک کے قبضہ میں رہتا تب بھی تلف ہو جاتا جیسے کھانا یا بکری کے تھنوں میں دودھ، تو ایسی صورتوں میں فقہاء کہتے ہیں کہ چوری پر قطع ید کی سزا نہ دی جائے گی۔ اب غور کرو کہ کہاں یہ شبہات، اور کہاں وہ قوی شبہہ جو ہم نے بیان کیا ہے۔ خصوصاً جب کہ حاجت مند کو شرعاً اس کی اجازت بھی دی گئی ہے کہ وہ مال کے مالک سے اس حد تک چھین کر لے سکتا ہے جو سدرمق کے لیے کافی ہو۔ اور یہ معلوم ہے کہ قحط سالی کے زمانہ میں عام طور پر لوگ حاجت مند اور مضطر ہوتے ہیں اور یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے کون واقعی محتاج و مضطر ہے اور کون نہیں ہے تو یہ بات بالکل مشتبہ ہو جاتی ہے کہ حالت قحط میں چوری کرنے والوں میں سے کون درحقیقت حد کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے، لہٰذا سب پر سے حد ساقط کر دی گئی۔ ہاں اگر بتحقیق معلوم ہو جائے کہ کسی نے بغیر حاجت واقعیہ چوری کی ہے تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹ دیا جائے گا۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر میں ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو یا ایک صاع کشمش یا ایک صاع پنیر دینے کا حکم دیا ہے۔ یہی چیزیں اس زمانہ میں اہل مدینہ کی خوراک کا غالب حصہ تھیں۔ اگر کسی ملک یا شہر کے باشندوں کی خوراک اس سے مختلف ہو تو انہی چیزوں میں سے کوئی چیز ایک صاع دینی چاہیے جن کو عام طور پر لوگ کھاتے ہوں، مثلاً دال، چاول وغیرہ۔ اور یہ بھی کچھ ضرور نہیں کہ وہ حبوب ہی کی قسم سے ہو۔ اگر لوگ کچھ اور کھانے کے خوگر ہوں، مثلاً گوشت، مچھلی یا دودھ، تو فطرہ بھی اسی میں سے نکالنا چاہیے یہ جمہور علماء کا قول ہے اور یہی صواب ہے۔ اس لیے کہ اصل مقصود تو یہ ہے کہ

عید کے روز مساکین بھوکے نہ رہ جائیں، اور ان تک بھی سامان خور و نوش پہنچ جائے، پس ان کو وہی چیزیں دینی چاہئیں جنہیں کھانے کے وہ عادی ہو۔ اس لحاظ سے غلہ کے بجائے آٹا دینے میں بھی کچھ حرج نہیں، اگرچہ یہ حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ رہا پکا ہوا کھانا دینا تو اگرچہ ایک لحاظ سے یہ مساکین کے لیے زیادہ مفید ہے کیونکہ وہ پکانے کی تکلیف سے بھی بچ جاتے ہیں، مگر دوسرے لحاظ سے غلہ زیادہ بہتر ہے، کیونکہ غلہ کو وہ چاہیں تو محفوظ بھی رکھ سکتے ہیں، بخلاف اس کے کھانا اگر ان کے پاس زیادہ مقدار میں جمع ہو جائے تو وہ اس کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ بعض لوگ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اصل مقصود تو اس روز ان کو مستغنی کر دینا اور سوال کی ذلت سے بچا دینا ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "آج کے دن ان کو سوال سے بے نیاز کر دو"۔ حضور نے غلہ نکالنے کے لیے جو حکم فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں لوگ عید کے دن خاص طور پر کچھ پکانے کے عادی نہ تھے بلکہ عموماً سال کے دوسرے دنوں میں جو کچھ کھاتے تھے وہی عید کے دن بھی کھا لیا کرتے تھے۔ بخلاف اس کے عید النحر میں قربانی کے گوشت سے قانع اور معتر کو کھلانے کا حکم دیا گیا، کیونکہ اس روز لوگ خاص طور پر یہی چیز کھایا کرتے تھے۔ پس اگر کسی ملک یا زمانہ میں لوگ عید الفطر کے دن خاص طور پر کچھ کھانے پکانے کے خوگر ہوں تو جائز ہی نہیں، لازم ہے کہ وہ انہی کھانوں میں سے غریبوں کو دیں۔ یہ قول بھی قابل لحاظ ہے اور اس پر عمل کرنے میں کچھ مضایقہ نہیں۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جب بکری کے تھنوں میں دودھ جمع ہو اور اس کو کوئی شخص خرید کر دودھ نچوڑے اور پھر بکری کو ناپسند کر کے واپس کرے تو اس دودھ کے عوض (جو اس نے نچوڑا ہے) ایک صاع کھجور بکری کے مالک کو دے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے حتیٰ کہ ان ملکوں میں بھی جہاں کھجور نہیں ہوتی بلکہ جہاں کے لوگوں نے کھجور دیکھی بھی نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ

ایسے مقامات پر ایک صاع کھجور کی قیمت دے دی جائے لیکن اگر کوئی شخص اپنے ملک کے غلات میں سے کوئی چیز ایک صاع دے دے تو وہ کافی نہ ہوگا۔ اکثر شافعیہ اور حنابلہ کا قول یہی ہے کہ جس طرح کھجور کی زکوٰۃ کھجور ہی ہے اسی طرح بکری کا دودھ نچوڑنے کی جزا بھی کھجور کے سوا کچھ نہیں گویا کہ انھوں نے دودھ کی جزا میں کھجور دینے کو عبادات میں داخل کیا ہے اور اس میں وہ لفظ نص کی پیروی واجب سمجھتے ہیں۔

دوسرے علماء نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس جگہ کھجور کے بجائے کچھ اور چیزیں غذا میں استعمال کی جاتی ہوں۔ وہاں انہی چیزوں میں سے کوئی بقدر یک صاع دی جائے مثلاً جہاں گیہوں کا رواج ہو وہاں گیہوں اور جہاں چاول کا رواج ہو وہاں چاول۔ اور اگر کسی کے پاس کشمش یا انجیر ہوں اور وہ ان میں سے ایک صاع کے بقدر نکال دے تو یہ بھی کافی ہوگا۔ یہی قول صحیح ہے۔ ابوالمحاسن رویانی اور بعض اصحاب احمد بن حنبل نے اسی کو اختیار کیا ہے اور مالکیہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ قاضی ابوالولید نے ابن القاسم کی یہ روایت نقل کی ہے کہ عام طور پر جس ملک میں جس چیز کا رواج ہو اسی میں سے ایک صاع دینا چاہیے۔ صاحب الجواہر نے اس مسلک کو بیان کر کے لکھا ہے کہ بعض احادیث میں لفظ تمر (کھجور) کے بجائے "طعام" کا لفظ آیا ہے اس لیے روایت مشہورہ میں صاعؑ من تمر کے جو الفاظ مروی ہیں ان کو اس معنی پر محمول کرنا چاہیے کہ جہاں کی عام غذا کھجور ہو وہاں کے لیے یہ حکم تھا۔

لاریب کہ یہی بات شارع کے مقصود سے اقرب ہے، اور ایسا ہی حکم ان تمام معاملات میں ہے جن میں شارع نے کسی خاص چیز کو کسی مقصد کے لیے متعین کیا ہو، اور اس مقصد کے لیے کوئی دوسری چیز ہر حیثیت سے اس شے خاص کی قائم مقام ہو سکتی ہو یا کسی حیثیت سے اس کے مقابلہ میں اولیٰ ہو۔ مثلاً حضور نے استنجا کے لیے پتھر تجویز فرمایا۔ مگر پتھر کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اصل مقصد

جس طرح پتھر سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ بہتر طریقہ سے کپڑے اور روئی اور اون سے حاصل ہوسکتا ہے، لہذا ، بدرجہ اولیٰ جائز ہونے چاہئیں۔ اسی طرح جس چیز کو کتے کا لب لگ جائے اُسے دھونے کے لیے آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مٹی تجویز کی ہے، مگر مٹی کی خصوصیت نہیں ہے راکھ اور کھلی اور ایسی ہی دوسری چیزیں بھی پاک کرنے کے لیے مفید ہوسکتی ہیں۔ غرض یہ کہ جن معاملات میں شارع کا مقصود ہم کو معلوم ہو اور اس مقصود کو شارع کی تجویز کردہ چیز کے مانند دوسری چیزوں سے حاصل کیا جاسکتا ہو تو وہ اس کی قائم مقام ہوسکتی ہیں۔

تنزیل و تاویل

اقسام قرآن

۱ ۲ ۳ ۴

"وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ"

از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی

ہر طالب قرآن کے ذہن میں مذکورۂ بالا سورہ (بروج) کے مطالعہ کے وقت قدرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ ان قسموں کا کیا مقصد ہے؟ یہ جواب تو قرین قیاس نہیں ہوگا کہ خدا نے ان چیزوں کی احتراماً قسم کھائی ہے... کیونکہ خدا سے اعلیٰ واجل آسمان و زمین میں کوئی چیز نہیں...

نفس یہ سوال کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن پاک میں کیوں قسمیں کھائی ہیں بہت اہم ہے اکابر علماء نے بھی اس کی اہمیت محسوس کی ہے، چنانچہ بعضوں نے تو اس کی تحقیق میں مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں علامہ ابن قیمؒ اور امام رازی رحمۃ اللہ کو خصوصیت کبریٰ حاصل ہے، ان دونوں اماموں نے ایک بڑی حد تک اس راہ کی گتھیاں سلجھائی ہیں۔ مقدم الذکر نے تبیان کے نام سے اس پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے لیکن موخر الذکر کی اس پر کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ جن جن سورتوں میں قسمیں وارد ہیں ان میں سے اکثر کے متعلق انہوں نے اپنی کتاب (تفسیر کبیر) میں بحث کی ہے.... بیسویں صدی کے ایک عالم نے بھی اس سوال کی تحقیق میں (امعان فی اقسام القرآن) کے نام سے ایک نہایت ہی جامع رسالہ لکھا ہے اور غالباً اس مسئلہ کی تحقیق میں اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب منصۂ شہود پر نہیں آئی ہے لیکن اس مقالہ میں اس کی تفصیل کی بالکل گنجائش نہیں اس لیے اس مبحث کو دوسری صحبت

کے لیے اظہار رکھتا ہوں، انشاء اللہ بشرط فرصت کسی دوسری صحبت میں اس پر بحث کروں گا۔ آج کی صحبت میں محض سورۂ بروج کی قسموں کا مقصد پیش کرنے کی کوشش کروں گا...... لیکن پیش نظر سورہ کی قسموں کا منشا دریافت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اجمالاً پہلے نفس قسم کا مفہوم متعین کر لیا جائے ورنہ حقیقت کے سراغ لگانے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اس لیے چند الفاظ میں پہلے نفس قسم کا مفہوم پیش کرنا مناسب ہوگا۔

عام طور پر لوگوں نے قسم اور اور تعظیم میں دامن اور چولی کا واسطہ سمجھ رکھا ہے اس نظریہ کی بنا پر قرآن پاک کی قسموں کی حکمت ان پر مخفی رہی اور باوجود انتہائی کوشش کے بھی ان کی حقیقت کا دروازہ ان پر بند رہا حالانکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قسم کا مقصد شہادت ہے...... ہاں اگر مقسم بہ کوئی محترم چیز ہو تو وہاں شہادت کے ساتھ تعظیم کا بھی پہلو ہوگا ورنہ محض شہادت ہی کا مثلاً وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا، فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا۔ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا۔ ان قسموں میں محض شہادت ہی کا پہلو ہے اور "لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔ قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ۔ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ۔ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يله" میں شہادت اور احترام دونوں پہلو ہیں۔ الغرض قرآن پاک کی بعض قسمیں تو محض شہادت پر مشتمل ہیں اور بعض میں شہادت اور احترام دونوں مدنظر ہیں۔

قسم کا یہ مفہوم ذہن نشین کر لینے کے بعد اب ہم اسی کی روشنی میں سورۂ بروج کی قسموں کا منشا، دریافت کریں گے لیکن اس کے لیے ضرورت ہے کہ پہلے مقسم علیہ کی تعیین کر لی جائے تاکہ قسموں کے صحیح مفہوم کی تعیین میں کسی طرح کی دقت نہ پیش آئے۔

سورہ بروج کی شہادتوں کا کہنا میں نے جہاں تک سیاق وسباق کی روشنی میں پیش نظر سورہ کی شہادتوں کے مقسم علیہ کی بابت غور و فکر کیا ہے اسی نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ یہ شہادتیں بد نوعیت پر پیش کی گئی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہ سکتے

ہیں کہ ان شہادتوں سے خدا نے اپنی سنت مجازات (دنیا و آخرت دونوں میں) پر استدلال کیا ہے اور اسی کی تائید ماقبل و مابعد کی سورتیں بھی کرتی ہیں اور یہی رائے اس بارے میں جمہور مفسرین رح کی بھی ہے، لیکن جب مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت کا سوال ہوتا ہے تو تقریباً سب خاموش نظر آتے ہیں۔ ...... میں نے ایک مناسبت تلاش کی ہے لیکن قبل اس کے کہ اسے پیش کیا جائے مناسب ہوگا کہ ایک نہایت ہی ضروری مرحلہ سے گذر لیا جائے جو اس سے کہیں زیادہ کٹھن اور دشوار گذار ہے وہ پیش نظر سورہ کی قسموں کی تعیین ہے اور در اصل اسی نے مفسرین رحمہم اللہ کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی ہے۔

سورۂ بروج کی شہادتوں کی شرح اور تعیین | (۱) والسماء ذات البروج "پہلی شہادت آسمان کی پیش کی ہے اور اس کی صفت برجوں والا بیان کی ہے، اس امر میں اختلاف ہے کہ بروج سے کیا مراد ہے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے قصور سماوی مراد ہیں، اور بعض بزرگوں کے نزدیک اس سے کواکب مراد ہیں، اور بعض حضرات اس سے چاند و سورج کی منازل مراد لیتے ہیں، یہی تین اقوال حد شہرت کو پہنچے ہوئے ہیں، ہمارے نزدیک ان تینوں اقوال میں سے کسی ایک کے بھی لینے میں کوئی خرابی نہیں اس پر تفصیلی بحث مناسبت کے سلسلہ میں آئے گی۔

(۲) والیوم الموعود" یہ دینونت پر دوسری شہادت ہے اس کے بارے میں سب کے سب متفق اللفظ ہیں کہ اس سے روز جزا ہی مراد ہے۔

(۳ و ۴) وشاھد ومشھود" ان دونوں شہادتوں کے بارے میں سلف سے بے شمار اقوال کتب تفاسیر میں مذکور ہیں۔ ... ہم ان میں سے دونوں کے متعلق چند مشہور اقوال تفسیر کبیر سے نقل کرتے ہیں۔

(۱) شاہد" جمعہ، انسان، محمد، قربانی کا دن، اللہ، کائنات۔

(۲) مشہود" عرفہ، قیامت، جمعہ، انسان

ہمارے نزدیک مذکورۂ بالا اقوال میں اقرب الی الصواب دو قول ہیں۔

(۱) وہ لوگ جو شاہد سے کائنات مراد لیتے ہیں۔ (تفسیر کبیر جلد ۸)

(۲) وہ لوگ جو مشہود سے انسان مراد لیتے ہیں یعنی یوں وہ تاویل کرتے ہیں کہ انسان خود اپنے خلاف شاہد ہے اور ان کے استدلال کی بنا قرآن پاک کی ان آیات پر ہے۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲۴ نور)

اس روز (قیامت) ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور پاؤں خود کردہ کی اپنے خلاف شہادت دیں گے

ایک دوسری جگہ یوں مذکور ہے۔

وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ - حم سجدہ (۲۱)

وہ کہیں گے اپنی کھالوں (اعضاء) سے تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ ہمیں وہ بلوا رہا ہے جس نے تمام چیزوں کو نطق عطا کیا ہے اور اسی نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے اور اسی کے پاس تم پھر لوٹائے جاؤ گے۔

(ہذا قول الخراسانی تفسیر کبیر جلد ۸)۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پیش نظر سورہ کا جو مقسم علیہ ہم نے ٹھیرایا ہے اس میں اور قسموں میں مناسبت ہے یا نہیں؟۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت تفصیل بالا سے یہ تو ثابت ہو گیا ہوگا کہ یہ چاروں شہادتیں ایک ہی دعوی کے اثبات میں پیش کی گئی ہیں وہ یہ ہے کہ مجازات کا قانون یقینی ہے چنانچہ اسی اصول کی بنا پر بہت سی قومیں صفحہ ہستی سے یکقلم مٹا دی گئیں۔ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ" اور اس کے ظہور کا اصلی دن قیامت ہوگا، يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ"...... رہا یہ سوال کہ آخر ان شہادتوں اور دعوی

میں کیا مناسبت ہے؟ یہ بہت ہی اہم ہے، اس لیے اس پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ چاروں قسموں کو لے کر الگ الگ مقسم علیہ سے ارتباط دکھلایا جائے۔

(۱) "وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ" یہ شہادت وقوع دینونت پر پیش کی گئی ہے اور اس کی صفت برجوں والی قرار دیا ہے، ..... ہم بروج کی شرح میں کہہ چکے ہیں کہ اس سے خواہ قصور سماوی مراد لیں یا کواکب لامعہ یا منازل شمس وقمر ہر ایک کا احتمال ہے اور معنی میں بھی کوئی خرابی نہیں معلوم ہوتی، اس لئے کہ بروج سے اگر قصور سماوی مراد لیں گے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ یہ سقف نیلگوں وقوع دینونت پر شاہد ہے، بروج کی قید اس لیے لگا دی کہ مخاطب اس کی طرف دیدۂ اعتبار سے دیکھ کر ایک صاحب جلال وجبروت اور عادل بادشاہ کا تصور قائم کرے، اور اگر بروج سے کواکب مراد لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ یہ درخشاں تاروں سے منظم آسمان وقوع جزا پر شاہد ہے اور اگر اس سے چاند وسورج کی منزلیں مراد لیں تو اس کا یہ مفہوم ہو گا کہ یہ آفتاب وماہتاب کا ایک خاص نظام کے ماتحت گردش کرنا اور ہر ایک کا اپنے اپنے دائرہ میں چکر لگانا شاہد ہے کہ یہ ڈھچر یوں ہی آپ سے آپ نہیں چل رہا ہے بلکہ اس کا ضرور کوئی نہ کوئی موجد ہے جو ہر طرح کے صفات کمالیہ سے موصوف ہے۔ تو ضرور اس نے اس عالم کے وجود میں لانے کا کوئی نہ کوئی مقصد پیش نظر رکھا ہوگا اسی کو ہم قیامت سے تعبیر کرتے ہیں لیکن پھر بھی اصل سوال علی حالہ باقی رہا یعنی مناسبت کا سوال۔ اس کے سمجھنے کے لیے، اصولی طور پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن مجید اثبات حقائق (اصول دین) میں کبھی تو عالم علوی کی چیزوں سے کام لیتا ہے کبھی عالم سفلی سے اور کبھی نظام انسانی کو دلیل میں پیش کرتا ہے۔ یہاں مجھے ان تمام دلائل سے بحث نہیں ہے بلکہ پیش نظر سورہ کی قسموں (شہادتوں) کے سمجھنے کے لیے صرف ان شہادتوں کی (خواہ وہ بطور قسم کے استعمال میں آئی ہوں یا آیت اور عبرت کے اسلوب میں) حکمت سے بحث کروں گا جو نظام علوی یا سفلی سے

متعلق ہیں''۔

میرے خیال میں نظام فوقانی کو بار بار شہادت میں اس لیے پیش کیا گیا کہ انسان اس نظام پر غور وفکر کرکے ایک ایسی ذات تک پہنچے جس کی حکمت لامحدود ہے، جس کا علم ساری کائنات کو محیط ہے، جس کی قدرت بے پناہ ہے اور جس کے ادنیٰ اشارہ سے یہ سارا نظام آناً فاناً میں درہم برہم ہوسکتا ہے۔ اور عالم سفلی کے شہادت میں پیش کرنے کی یہ حکمت ہے کہ انسان اگر ان مصنوعات باری پر بھی نظر ڈالے جو ہمہ آن اس کی نظروں کے سامنے ہیں تو وہ محسوس کرے گا کہ ان میں سے ہر ایک زبان حال سے ایک صاحب جلال وجبروت کی گواہی دے رہی ہے۔

سورۂ جاثیہ میں ہے۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۳۔ جاثیہ)	بیشک آسمانوں اور زمین میں مومنین کے لیے (وجود باری پر) شہادتیں ہیں۔

ایک دوسری جگہ یوں مذکور ہے

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ (۱۹۰ آل عمران)	بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات و دن کی گردش میں سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لیے (نظام عالم کے باغایت ہونے پر) دلائل ہیں۔

سورۂ یونس میں ہے۔

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (۶۔ یونس)	بیشک رات دن کی گردش میں اور جو کچھ آسمان و زمین میں خدا نے پیدا کیا ہے اہل تقویٰ کے لیے (وجود باری پر)..... دلائل ہیں۔

انہی شہادتوں کو قرآن پاک نے قسم کے اسلوب میں بھی پیش کیا ہے، ملاحظہ ہو!۔

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ، (۱۔ طارق) شاہد ہے آسمان اور ستارے ۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (۷۔۱ شمس) شاہد ہے سورج اور اس کی روشنی اور چاند جبکہ اس کے پیچھے آئے اور دن جبکہ اسے (دنیا) پُر نور کر دے اور رات جبکہ اسے ڈھانک لے اور آسمان اور اس کی صنعت اور زمین اور اس کی گسترد گی، اور انسان اور اس کا (تمام قوی کمالیہ سے) مزین ہونا ۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۱۔ نجم) شاہد ثریا جبکہ ڈھل جائے ۔

پیش نظر سورہ کی پہلی شہادت نظام فوقانی ہی سے متعلق ہے یعنی اس چرخ کو شہادت میں پیش کر کے لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ خود ہی فیصلہ کریں کہ کیا یہ چرخ آپ ہی آپ چل رہا ہے۔ ظاہر ہے کوئی بھی اس معلول کو خود اس کی علت قرار نہ دے گا بلکہ سب کے سب ایک ایسی طاقت کے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں جو اس پورے نظام کو چلا رہی ہے اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کا مدبر کوئی معمولی نہیں ہے اس لئے کہ ایسے عظیم الشان نظام کا اس پابندی کے ساتھ چلانا کسی معمولی طاقت کا کام ہونا خلاف عقل مشاہدہ ہے تو ضرور ہے کہ اس کا مدبر ہر طرح کے صفات کمالیہ (حکمت، قدرت، ربوبیت، عدل، رحمت،) کا جامع ہوگا۔ اسی کو ہم خدا سے تعبیر کرتے ہیں اور جب وہ ان صفات کمالیہ سے متصف ہے (اور یقیناً ہے) تو ضرور ہے کہ اس نے یہ سقف نیلگوں اور یہ فرش زمردین یوں ہی بلا مقصد نہیں بچھائی ہوگی بلکہ اس کے یہ تمام مظاہر قدرت اس کی اصلی رحمت کے ظہور کا پتہ دے رہے ہیں۔ اس کو ہم دینونت سے تعبیر کرتے ہیں۔ خود قرآن پاک میں وقوع قیامت کو رحمت ازدی کا سبب ٹھیرایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ کہو آسمان اور زمین کس کی ملکیت ہے؟ کہو خدا کی اس نے

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ اپنے اوپر رحمت فرض کرلی ہے کہ وہ ضرور تم کو قیامت
الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۔ الآیت ۔ (۱۲ انعام) کے دن جمع کرے گا اس میں شک وشبہہ کی گنجائش نہیں

خلاصہ یہ کہ پیش نظر سورہ کی پہلی شہادت (والسماء ذات البروج) سے اس کے موجد پر استشہاد کیا ہے اور اس (موجد باری تعالیٰ) کے صفات سے وقوع دینونت پر استدلال کیا ہے، اور صفات سے کلیات دین پر استدلال قرآن پاک میں بہت شائع و ذائع ہے۔

(۲) وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ" یہ وقوع دینونت پر دوسری شہادت ہے، سوال ہو سکتا ہے کہ یہ کیا؟ ایک ہی چیز دعویٰ بھی اور دلیل بھی؟ لیکن اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ بعض چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے اثبات کے لیے خارجی دلائل کی بالکل محتاج نہیں ہوا کرتیں۔ بلکہ وہ دعویٰ اور دلیل دونوں کا کام دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر آپ سے کوئی ٹھیک بارہ بجے دن میں یہ سوال کرے کہ کیا دلیل ہے کہ اس وقت رات نہیں، دن ہے؟ تو اس کا بہترین جواب تو یہ ہے کہ آپ خاموش رہیں۔ اور اگر جواب ہی دینا چاہتے ہوں تو یہ مصرع پڑھ دیجیے!

آفتاب آمد دلیل آفتاب

اور اگر اس کے اثبات کے لیے منطقی دلائل وبراہین کی جستجو میں پڑے تو یقین رکھیے کہ اس کی صداقت کو آپ اجاگر نہ کریں گے بلکہ اس پر اور پردہ ڈالیں گے..... یہی صورت حال زمانہ نزول قرآن میں بھی تھی کفار وقوع قیامت پر آیات بینات مانگتے۔ چونکہ یہ چیز بدیہی تھی اس لیے کہ بغیر اس کے ماننے کائنات کا بطلان لازم آتا ہے، قرآن نے کہیں تو اس کے اثبات کے لیے اپنی صفت حکمت وقدرت سے کام لیا ہے، اور بعض جگہ اظہار بداہت کے لیے اسی کو شہادت میں پیش کیا ہے۔ بعینہ اسی طرح اثبات صداقت قرآن کے باب میں بھی بعض جگہ تو اس کے منزل من اللہ ہونے پر دلائل عقلیہ وفطریہ کا انبار لگا دیا ہے اور بعض جگہ قرآن پاک ہی کو شہادت میں پیش کر دیا ہے

تفصیل کی گنجائش نہیں،۔

(۳) "وَشَاهِدٍ" یہ وقوع وینونت پر تیسری شہادت ہے، ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سے کائنات مراد ہے یعنی وقوع جزا پر اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ زبان حال سے شہادت دے رہا ہے۔ یہ کوئی انوکھا استشہاد نہیں ہے قرآن نے اس تعمیم کے ساتھ اور مواقع پر بھی استدلال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۴۰۔ حاقہ) — شاہد ہیں مرئیات (عالم سفلی)، اور غیر مرئیات (عالم علوی) یہ ایک بزرگ فرستادہ کا کلام ہے۔

دیکھیے مذکورہ بالا آیت میں لفظ "بما تبصرون" جس سے یہ پورا عالم ظاہر مراد ہے شہادت میں پیش کیا ہے،

ایک دوسرے مقام پر بھی یہی تعمیم ہے۔

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ۔ (۶۔ یونس) — بیشک لیل و نہار کی گردش میں اور جو کچھ کہ خدا نے آسمان و زمین میں پیدا کیا ہے اہل تقویٰ کے لیے دلائل (وجود باری پر) ہیں۔

دیکھیے مذکورہ بالا آیت کے اس ٹکڑے (وَمَا خلق اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالارض) میں بھی وہی تعمیم ہے یعنی عالم ظاہر و باطن کا ایک ایک ذرّہ زبان حال سے خدا کی وحدانیت اور وقوع جزا کے وجوب کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔

(۴) "وَمَشْهُوْدٍ" یہ وقوع وینونت پر چوتھی شہادت ہے ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سے انسان مراد ہے...... دعویٰ اور دلیل کے ارتباط کے باب میں اگر آپ امعان نظر سے کام لیں گے تو مختلف وجوہ سے انسان کا وجود وقوع وینونت پر شاہد نظر آئے گا۔

(۱) انسان کا وجود دلیل قیامت ہے یہ تو سب کو تسلیم ہے کہ دنیا میں جتنی موجودات ہیں ہر ایک کی پیدائش میں

کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ پس ضرور ہے کہ انسان کے وجود کا بھی کوئی مقصد ہو، یہ تو صحیح نہیں کہ اس کا وجود محض اس لیے ہوا ہو کہ چند دن لذائذ دنیوی سے متمتع ہو کر پیوند خاک ہو جائے اگر یہی مقصد ہے تو یہ بہت ہی گھٹیا ہے اور اس کو وجود میں لانے والا حکیم نہیں ہو سکتا۔ جب اس کا صانع ایک حکیم ہے تو یقیناً اس کی ایجاد کا کوئی مقصد ہو گا۔ یہی مقصد اور غایت ہے جس کا ظہور اس دن ہو گا جب کہ عدالت کبریٰ قائم ہو گی۔ اس لیے بے شمار جگہ خدا نے قرآن پاک میں نفس انسان کو دلیل معاد ٹھیرایا ہے"۔

سورہ قیامت میں ہے۔

وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ (۲۔ قیامۃ) — اور شاہد ہے نفس لوامہ۔

ایک دوسری جگہ یوں مذکور ہے۔

وَفِيۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ‌ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (۲۱ ذاریات) — خود تمہارے وجود میں (وقوع قیامت پر) بے شمار دلائل ہیں

سورہ شمس میں ہے۔

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰٮهَا (۷۔ شمس) — اور انسان اور اس کی تخلیق عجیب شاہد ہے۔

ایک دوسرے مقام پر یوں ہے۔

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰٓى (۳۔ لیل) — اور شاہد ہے مذکر اور مونث مخلوق۔

(۲) انسان کا عجز اور اس کی بے بسی | قرآن پاک میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شمار مقامات پر خدا نے انسان کی بے بسی و لاچاری سے بھی وقوع قیامت پر استدلال کیا ہے؛

سورۂ طارق میں ہے۔

فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ‌۔ خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ۔ يَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَالتَّرَآئِبِ — انسان کو غور کرنا چاہیے کہ کس چیز سے اس کا وجود ہوا ہے؟ اچھلتے ہوئے پانی سے، جو نکلتا ہے ریڑھ

إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ (۵-۹) طارق

اور پسلیوں کے درمیان، ضرور وہ انسان کے باز وجود میں لانے پر قادر ہے جس دن کہ اس کے دل کی باتوں کی جانچ ہوگی اور نہ ہوگا اس کا کوئی یاور وغمگسار"۔

ایک اور مقام پر یوں وارد ہے۔

مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ (۱۸تا۲۲عبس)

کتنی حقیر شے سے اسے پیدا کیا ہے؟ صاف وشفاف پانی سے، اولاً اس کی تخلیق کی، پھر اس کی تقدیر کی پھر راستہ اس کے لیے آسان کردیا، پھر اسے مردہ کرکے قبر میں ڈالدیا پھر جب چاہے گا اٹھا کھڑے گا۔

سورہ قیامہ میں ہے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ يُمْنَىٰ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ (۳۶-۴۰) قیامہ۔

کیا انسان کا یہ خیال ہے کہ وہ یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ اس سے پہلے بے حقیقت قطرہ نہ تھا پھر منجمد خون کی صورت میں ہوگیا پس اولاً اس کی تخلیق کی پھر اسے آراستہ کردیا۔ پھر اس نے پیدا کیا اس سے مذکر اور مونث، کیا وہ از سرنو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔

نماز اخلاص

(از جناب مولنا عبد اللہ العمادی)

اِنَّ صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ

اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔

(۰)

جد مرحوم نے بچپن میں شیخ شرف الدین بخاری کا منظومۂ فقہیہ مجھے یاد کرایا تھا جس کی ابتدا نامِ حق سے تھی، پنجاب کی متعدد مسجدوں کے پیشطاق پر میں نے اس کی یہ بیت ثبت دیکھی:۔

روز محشر کہ جاں گداز بود — اولیں پرسش نماز بود

یہ مقالہ کہ اسی نماز اور اس کی پرسش سے تعلق رکھتا ہے، علم صدق اس کی تہذیب میں مدتوں تعلل کرتا رہا، حتیٰ کہ عمل صدق کی توفیق نے مہذب فرمایا، و باللہ التوفیق۔

بہ ہر کارے کہ ہمت مے گمارے — نصرت از حق جو

کہ بر کنجشک دام افگندم — و صید ہما کردم

(۱)

اسلام کا بیان پیغمبر اسلام کی زبان سے اسلام کیا ہے؟ علماء حق نے مختلف حیثیتوں سے اس کی تعریف و تحدید کی ہے، آئیے اس باب میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کریں، سنن ابی داؤد میں طلحہ بن عبد اللہ سے روایت ہے:

جاء رجل الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اھل نجد یسمع دوی صوتہ ولا یفقہ ما یقول حتی دنا فاذا ھو یسأل — کی جناب میں نجد کا

عن الاسلام، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خمس صلوٰت فی الیوم واللیلۃ قال ھل علیّ غیرھن، قال لا، الا ان تطوع، قال وذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صیام شھر رمضان قال ھل علیّ غیرہ قال لا، الا ان تطوع و ذکر لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصدقۃ، قال فھل علیّ غیرھا قال لا، الا ان تطوع، فادبر الرجل وھو یقول واللہ لا ازید علی ھذا ولا انقص، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افلح ان صدق۔

ایک شخص حاضر ہوا، اس کی آواز کی گونج تو سنائی دیتی تھی مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہہ رہا ہے، قریب آیا تو اسلام کے متعلق پوچھ رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں ادا کی جائیں، عرض کی ان کے علاوہ کوئی اور نماز بھی مجھ پر لازم ہو گی؟ فرمایا، نہیں، بجز اس کے کہ تم خود سے نفل ادا کرو، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رمضان کے روزے یاد دلائے پھر عرض کی: ان کے سوا کچھ اور روزے بھی ہیں؟ فرمایا: نہیں، بجز اس کے کہ نفل ادا کرو، آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زکوٰۃ یاد دلائی تو پھر عرض کی: اس کے علاوہ کچھ اور؟ فرمایا: نہیں، بجز اس کے کہ نفل ادا کرو، آخر وہ شخص یہ کہتا ہوا واپس چلا کہ اللہ کی قسم، میں نہ تو اس پر کچھ بڑھاؤں گا نہ اس میں کمی کروں گا، اس پر آنحضرت صلوٰۃ اللہ علیہ نے فرمایا: سچ کہا تو فلاح پائی۔

اس میں پہلا درجہ صلوٰۃ کا ہے، اور سب اس کے بعد ہیں۔

فرائض کی حفاظت وعن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خمس من جاء بھن مع ایمان دخل الجنۃ من حافظ علی الصلوٰت الخمس علی وضوئھن

ابو درداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جناب الٰہی میں ایمان کے ساتھ جو کوئی ان پانچ کو لے کے آیا بہشت میں در آیا۔

وہ جس نے نماز پنجگانہ کی حفاظت لازم رکھی، وضوئن کی

وركوعهن وسجودهن ومواقيتهن و	رکوع میں بھی، سجدہ میں بھی، اور اوقات صلوٰۃ میں بھی
صيام رمضان، وحج البيت ان استطاع	وہ جس نے رمضان کے روزے رکھے۔ وہ جس نے استطاعت
اليه سبيلا، واعطى الزكاة طيبة بها	رکھتے ہوئے بیت اللہ کا حج کیا۔ وہ جس نے خوش دلی سے
نفسه، وادى الامانة۔	زکوٰۃ دی۔ وہ جس نے امانت ادا کی۔
قالوا يا ابا الدرداء وما اداء الامانة؟ قال	لوگوں نے ابوالدرداء سے پوچھا کہ ادائے امانت سے
الغسل من الجنابة۔	کیا مراد ہے؟ جواب دیا کہ غسل جنابت

ابو قتادہ بن ربعی سے سعید بن المسیب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد کیا ہے:۔

حفظ صلوٰۃ

انی فرضت علی امتک خمس	اے پیغمبر میں نے تیری امت پر پانچ نمازیں فرض کی
صلوات وعهدت عندی عهدا انه	ہیں اور عہد کیا ہے کہ جس نے ٹھیک وقت پر ان
من جاء يحافظ عليهن لوقتهن ادخلته	کی حفاظت کی، میں نے اس کو بہشت میں داخل کر لیا
الجنة، ومن لم يحافظ عليهن فلا	لیکن جس نے حفاظت نہ کی تو میری جناب میں اس کے
عهد له عندی۔	لیے کوئی عہد نہیں۔

عبادہ بن صامت کی حدیث میں اس کی زیادہ تشریح ہے، کہتے ہیں:

اللہ کا عہد

سمعت رسول الله صلى الله عليه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یہ فرماتے ہوئے
وسلم يقول خمس الصلوات افترضهن	سنا کہ اللہ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں جس نے ان کے
الله عز وجل من احسن وضوءهن	لیے بخوبی وضو کیا، ٹھیک وقت پر نماز پڑھی، پورے
وصلاهن لوقتهن واتم ركوعهن	پورے رکوع لئے اور خشوع کا حق ادا کیا، تو اللہ پر اس کا
وخشوعهن كان له على الله عهد ان يغفر له	عہد ہے کہ اللہ اس کو بخش دے گا۔

معلوم ہوا کہ نماز کی پہلی شرط رجوع الی اللہ و تعدیل ارکان و حفظ اوقات ہے، ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔

نماز میں کب تاخیر کریں سمعتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول لا یصلی بحضرۃ الطعام ولا وھو یدافعہُ الاخبثان۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ کھانا آگیا ہو تو نماز شروع نہ کرنی چاہیے اور بول و براز کی حاجت ہو تو پہلے اس سے فراغت کرلینی چاہیے۔

یعنی حضور قلب میں جو موانع حائل ہو سکیں پہلے ان سب سے یکسوئی کر لیجیے پھر نماز پڑھیے۔

منافقوں کی نماز جلدی جلدی نماز پڑھنے کی انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو "تلک صلوٰۃ المنافقین" فرمایا ہے (یہ منافقوں کی نماز) تین مرتبہ اسی کی تکرار کی ہے اور پھر فرمایا ہے :-

یجلس احدھم حتّٰی اذا اصفرت الشمس فکانت بین قرنی الشیطان، او علیٰ قرنی الشیطان قام فنقر اربعًا لایذکر اللّٰہ عزوجل فیھا الاقلیلاً۔

ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے، جب آفتاب زرد ہو کے شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان چلا گیا، یا شیطان کے دونوں سینگوں کے اوپر آگیا، تو وہ شخص اٹھا اور چار چونچ ماری جن میں بہت کم اللہ کو یاد کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاخیر نماز عصر کے موقع پر یہ فرمایا تھا۔ راوی کو ٹھیک یاد نہ رہا کہ آنحضرت سلام اللہ علیہ نے غروب کے وقت قریب یہ فرمایا تھا کہ آفتاب شیطان کے دونوں سینگوں کے بیچ میں آگیا، یا یہ ارشاد ہوا تھا کہ دونوں سینگوں کے اوپر آگیا، بہرحال جو کچھ بھی ہو، اس کے متعدد معنے بیان ہوئے ہیں جن میں سے ایک معنی "مرقاۃ الصعود" (شرح سنن ابی داود) سے نقل کرتے ہیں :-

شیطان کے سینگ

وقيل انه تمثيل وتشبيه وذلك ان تاخير الصلوٰة انما هو تسويل الشيطان لهم وتسويفه وذوات القرون انما تعالج الاشياء وتدفعها بقرونها، فكانهم لما دافعوا الصلوٰة واخروها عن اوقاتها بتسويل الشيطان لهم حتى اصفرت الشمس صار ذلك منه بمنزلة ما يعالجه ذوات القرون بقرونها وتدفعه با دونها۔

کہا جاتا ہے کہ شیطان کے سینگ سے تمثیل و تشبیہ مقصود ہے، ظاہر ہے کہ شیطان کے وسوسہ اور دیر کرانے سے نماز میں تاخیر ہوئی، سینگ والے جانوروں کی عادت ہے اپنے سینگوں سے چیزوں کو ہٹاتے اور دفع کرتے ہیں، گویا جن لوگوں نے نماز کو وقت سے ہٹا کے پڑھا اور شیطان کے بہکانے سے اتنی تاخیر کی کہ آفتاب کا رنگ زرد ہو کر قریب بہ غروب آگیا، تو اس کی مثال بمنزلۂ ان سینگ والے چارپایوں کے ہے جن کے سینگ میں کوئی چیز پھنس جائے اور وہ اس کو ہٹا ہٹا کر دفع کرتے ہیں۔

وہ نماز جس میں افراط و تفریط نہ ہو

اسلام نے وسط کے درجہ کو بہترین قرار دیا ہے، عبادت میں کمی تو معیوب ہی ہے، زیادتی بھی پسندیدہ نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال يوم الخندق: حبسونا عن الصلوٰة الوسطى الصلوٰة العصر، ملأ الله بيوتهم وقبورهم نارا۔

غزوہ خندق کے دن کفار سے مقابلہ کی مشغولیت اتنی تھی کہ نماز عصر میں بہت ہی دیر ہو گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان لوگوں نے ہم کو نماز وسطیٰ نماز عصر سے روکے رکھا، اللہ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔

ظاہر ہے کہ یہاں نماز وسطیٰ سے نماز عصر مراد نہیں، نماز عصر آخر وقت میں سہی، ادا تو ہو گئی، ابوہریرہ کی حدیث میں ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ادرك من العصر ركعة قبل ان تغرب الشمس فقد ادرك، ومن ادرك من الفجر ركعة قبل ان تطلع الشمس فقد ادرك	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج ڈوبنے سے پہلے جس نے عصر کی ایک رکعت نماز پالی تو اس نے نماز پالی اور سورج نکلنے سے پہلے جس نے فجر کی ایک رکعت نماز پالی تو اس نے نماز پالی۔

یہاں نماز وسطیٰ سے ایسی نماز مراد ہے جس کے لیے اتنا کافی وقت ہو کہ پورے خشوع خضوع و تعدیل سے ادا کی جا سکے۔

اگرچہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نماز عصر ہی کو نماز وسطیٰ کہتے تھے اور فرماتے تھے۔

شان نزول وسطیٰ: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي الظهر بالهاجرة ولم يكن يصلي صلوٰة اشد على اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم منها فنزلت حافظوا على الصلوٰت والصلوٰة الوسطىٰ وقال ان قبلها صلاتين و بعدها صلاتين۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زوال آفتاب کے بعد شدید حرارت و تمازت کے وقت ظہر کی نماز ادا فرماتے تھے، صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس سے زیادہ سخت اور کوئی نماز نہ تھی، تب یہ آیت نازل ہوئی کہ "نمازوں کی اور نماز وسطیٰ کی حفاظت کرو" زید بن ثابت نے بیان کیا کہ نماز عصر سے قبل بھی دو نمازیں ہیں اور اُس کے بعد بھی دو نمازیں ہیں۔

(چاروں کے بیچ میں پانچویں نماز عصر ہے اور وہی درمیانی نماز یعنی وسطیٰ ہے)۔

محدثین نے تصریح کی ہے کہ یہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تھا۔ بہرحال یہ بحث اپنے مقام پر آئے گی۔

(۲)

(۲)

ایمان بالغیب کے بعد قرآن کریم کی سب سے پہلی تعلیم اقامت صلاۃ ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ صلاۃ کے احکام و اقسام کیا ہیں اور کیوں ہیں؟ پیش نظر صرف وہ خصوصیات ہیں جن پر کلام اللہ وحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بار بار زور دیا گیا ہے۔

اس ذیل میں متعدد امور بحث طلب ہیں:۔

صلاۃ | ادبیات عرب میں صلاۃ کسے کہتے ہیں؟

کلام جاہلیت میں یہ لفظ دعا کے لیے استعمال ہوتا تھا، اعشیٰ کا قول ہے:۔

لہا حارس لا یبرح الدھر بیتہا وان ذبحت صلی علیہا وزمزما

(صلی علیہا یعنی بذلک دعا لہا، اس کے لیے دعا کی)

ایک اور جاہلی شاعر کا شعر ہے:۔

وقابلہا الریح فی دنہا وصلی علی دنہا وارتسم

یہاں بھی دعا ہی کے معنی ہیں۔

ایک اور قصیدہ میں ہے۔

علیک مثل الذی صلیت فاغتمضی عیناً، فان لجنب المرء مضطجعا

صلاۃ کے دوسرے معنی لزوم کے تھے۔ جاہلیت کی ایک نظم کا یہ شعر مشہور ہے۔

لم اکن من جناتہا علم اللہ وانی بحرہا الیوم صالی

یہاں صالی کے معنی لزوم رکھنے والے کے ہیں۔

کسی شخص کے پیرو کو بھی مصلی کہتے تھے، اور اس پیروی و اتباع کا نام صلاۃ تھا۔ اصل میں مصلی کا لفظ گھوڑے کے لیے موضوع تھا جو کسی دوسرے گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلتا ہو بعد کو تخصیص جاتی رہی، معنی میں تعمیم آ گئی اور ہر قسم کی پیروی کو صلاۃ اور پیرو کو مصلی کہنے لگے

یہ تو صلاۃ کے عام معنی ہوئے لیکن مشرکین عرب میں صلاۃ کا ایک خاص طریقہ تھا جس کی تشریح قرآن کریم نے کی ہے، سورہ انفال میں ہے۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً — خانۂ کعبہ کے پاس ان کی نماز کیا تھی؟ تالی بجانی اور سیٹی

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ۔ — دینی تم جو کفر کیا کرتے تھے اب اسکے بدلے عذاب کا مزہ چکھو۔

روایات و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، ایک روایت میں ہے:۔

ماکان صلاتھم التی یزعمون انھا یدرأ — صلاۃ جس کی نسبت مشرکین عرب کا زعم تھا کہ یہی عبادت

بھا عنھم الا مکاء و تصدیۃ۔ [1] — ان سے بارگاہ ہٹائیگی وہ صرف تالیاں اور سیٹیاں بجانا تھی۔

اسلام نے اس غیر مہذب طریقے کی اصلاح کی، اس کو مذموم بتایا، صلاۃ کی ایک خاص ہیئت مقرر کر دی ~~اور ایسی مقرر کر دی~~ اور ایسی مقرر کر دی جو انسان کے اخلاق ملکوتی کا بہترین ذریعہ ہو سکتی ہے۔

یہودیوں اور نصرانیوں میں بھی صلاۃ کا رواج تھا۔ ایرانیوں میں بھی مُغوں، موبدوں اور بادشاہوں کی تعظیم کو "نماز" کہتے تھے، مگر یہ خاص طریق خشوع کہیں نہ تھا۔ اور عبودیت الٰہی کی حقیقت سے کسی کو واقفیت نہ تھی۔ یہ خصوصیت اسلام کی ہے وہ خود صلاۃ کے تذکرہ میں اس پر زور دیتا ہے۔

فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ — اللہ کو اس طریق پر یاد کرو جس کی خدا نے تمہیں تعلیم دی ہے اور جس سے پہلے تم ناواقف تھے۔

ذکر یعنی اللہ کی یاد سے کلام اللہ میں جا بجا نماز مراد ہے۔

سجدہ | صلاۃ کا جزو اعظم سجدہ ہے، سجدہ جس کے اصلی معنی اہل لغت نے کمال اطاعت و انقیاد اور خضوع کے لکھے ہیں، کلام عرب میں بھی یہی معنی متبادر تھے، ایک مشہور مصرع ہے۔

تَرَى الْأُكْمَ فِيهَا سُجَّدًا لِلْحَوَافِرِ

---

[1] ۱۲ ابو جعفر قال حدثنا ابن حمید قال حدثنا سلمۃ عن ابن اسحٰق، وماکان صلاتھم عند البیت الا مکاء وتصدیۃ قال ماکان صلاتھم الخ

گھوڑے کی سرعت رفتار کا یہ عالم تھا کہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں
اس کے سموں کی مطیع نظر آتی تھیں۔

قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں یہی معنی مراد ہیں، مثلاً۔ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ۔ كُلٌّ لَهُ يَسْجُدُوْنَ۔ ونحوہما۔

امام رازی سجدہ کے لغوی واصطلاحی معانی کی نسبت لکھتے ہیں۔

ان السجود لا شك انه فی عرف الشرع عبارة عن وضع الجبهة علی الارض فوجب ان یکون فی اصل اللغة کذالك لان الاصل عدم التغیر (۲۹)

کوئی شک نہیں کہ شریعت میں سجدہ کے معنی زمین پر پیشانی رکھنے کے ہیں۔ اس سے ضروری ہے کہ اصل لغت میں بھی یہی معنی ہوں کیونکہ اصل الاصول یہی ہے کہ معنی بدل نہ جائیں۔

ہم تسلیم کرتے ہیں مصطلحات میں لغوی معنی کی کچھ نہ کچھ مناسبت ضرور ملحوظ رہنی چاہیے اگر سجدہ کی شرعی اصطلاح میں یہ مناسبت مقصود نہیں ہے۔ صلاۃ میں جس انداز سے سجدہ کرتے ہیں، اس سے زیادہ فروتنی و تذلل کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ علم اللسان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ اصل لغت کے لحاظ سے اصطلاح میں کیا کچھ تبدیلیاں نہیں ہو جاتی ہیں؟ رکوع کے معنی صرف جھکنے کے تھے، اصطلاح نے ایک خاص قسم کے جھکنے کی تخصیص کر دی۔ صلاۃ صرف دعا کو کہتے تھے، اصطلاح نے ایک مخصوص انداز دعا کا نام صلاۃ رکھ دیا۔ جہاد کا لفظ محض سعی و کوشش کے لیے موضوع تھا، اصطلاح نے اس میں ایک تخصیص سعی کی شان پیدا کر دی وقس علی ھذا القیاس۔ عجیب بات یہ ہے کہ خود امام رازی نے وادخلوا الباب سجداً کی تفسیر میں سجدہ کے معنی تواضع ہی کے لیے ہیں اور فقط اس قدر معذرت کر کے کافی سمجھا ہے کہ سجدہ کے شرعی معنی یہاں درست نہیں اترتے۔[۱]

---

[۱] رازی تفسیر سورہ یوسف،

(۳)

اقامت صلاۃ | قرآن کریم میں صلاۃ کا لفظ جہاں کہیں آیا ہے۔ اقامت کے صیغوں کے ساتھ آیا ہے۔ عربی میں اقامت کے معنی یہ ہیں کہ کسی کام کو اس کی تمام و کمال شرائط و حدود کے ساتھ انجام دیا جائے۔ محاورے میں کہتے ہیں:۔ اقام القوم سوقہم، اذا لم یعطلوھا عن البیع و الشراء۔ ایک شاعر اپنے مخصوص قدیم انداز تفاخر میں شکایت کرتا ہے:۔

اقمنا لاھل العراقین سوق الضراب تحاموا وولوا جمیعا

روایات میں ہے۔

اقامۃ الصلوٰۃ تمام الرکوع والسجود والتلاوۃ والخشوع والاقبال علیھا فیھا الخ

اقامت صلاۃ کے معنی رکوع و سجود اور تلاوت و خشوع کے حق کو نہایت مکمل طریق پر سبکدوش ہونے اور صلاۃ کی غایت کی جانب اچھی طرح توجہ کرنے کے ہیں

یعنی ایک مسلمان کے لیے صرف اقامت الصلوٰۃ ہی کافی نہیں ہے، صلاۃ کی اغراض و غایات کی تکمیل بھی ضروری ہے۔ قرآن کہیں بھی رسمی صلاۃ ادا کرنے کا حکم نہیں دیتا وہ تکمیل حدود کا خواستگار ہے اور صاف کہہ رہا ہے کہ بغیر اس تکمیل کے صلاۃ صلاۃ ہی نہیں۔

شیخ ابو القاسم حسین بن محمد بن الفضل الراغب لکھتے ہیں۔

کل موضع مدح اللہ تعالیٰ بفعل الصلاۃ اوحث علیہ ذُکر بلفظ الاقامۃ نحوُ وَ المقیمینَ الصلاۃَ" و "اَقیموا الصلاۃَ" وَ "اقاموا الصَّلاۃَ" ولم یقل المصلین الا فی المنافقین نحو قولہ فَوَیلٌ لِلمُصَلِّینَ الَّذِینَ

جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے فعل صلاۃ کی تعریف کی ہے یا اس کی طرف رغبت دلائی ہے وہاں صلاۃ کا ذکر اقامت کے ساتھ ہے، مثلاً "نماز قائم کرنے والے۔ نماز قائم کرو۔ نماز قائم کی" مُصلّی (نماز پڑھنے والے) صرف منافقوں کو کہا ہے، مثلاً حیف ان مصلیوں (نمازیوں)

هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ" و "لَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى	جو اپنی نماز میں بھولتے ہیں۔ نماز پڑھتے بھی ہیں تو سستی دیے دلی کے ساتھ۔
وانما خص لفظ الاقامة تنبيها ان المقصو من فعلها توفية حقوقها وشرايطها لا الايتان بهيأتها فقط ولهذا روى ان المصلين كثير والمقيمين لها قليل[۱]	صلاۃ کے لیے اقامت کا لفظ خاص طور پر اس تنبیہ کے لیے کہ نماز پڑھنے کا مقصود یہ ہے کہ نماز کے حقوق و شروط پورے ہوں، خالی نماز کی شکل مقصود نہیں اسی لیے روایت ہے کہ "نمازی تو بہت ہیں مگر نماز کے قائم کرنے والے تھوڑے ہیں[۲]"

(۴)

استعانت بالصبر والصلاۃ

قرآن کریم نے اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کا دو مقام پر حکم دیا ہے، استقلال و شکیبائی اور صلاۃ کے ذریعے مشکلات میں مدد مانگا کرو، یعنی ان چیزوں سے تمہیں اعانت ملیگی، تمہاری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ مہمات امور میں تمہیں انہی سے رجوع کرنا چاہیے۔

حدیث میں ہے۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا حزبه امر فزع الى الصلاة[۳]	جب کوئی مہم پیش آتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلاۃ کی جانب رجوع فرماتے ہیں۔

دوسری روایت میں ہے۔

انهما اى الصبر والصلوٰة معونتان على	استقلال اور صلاۃ، یہ دونوں نزول رحمت الٰہی میں

---

[۱] رازی، تفسیر سورۂ یوسف [۲] المفردات فی غرایب القرآن، طبع میمنیہ مصر۔
[۳] ابوجعفر قال حدثنا عثمان بن سعید عن بشر بن عمارة عن ابی روق الضحاک عن ابن عباس ويقيمون الصلاة، قال اقامة الصلاة الخ
[۳] ابوجعفر قال حدثنی اسمعیل بن موسی الفزاری قال حدثنا الحسین بن رتاق الهمدانی عن ابن جریج عن عکرمہ بن عمار عن محمد بن عبید بن ابی قدامة عن عبد العزیز بن الیمان عن حذیفة قال الخ

رحمة الله۔ لہ اعانت کیا کرتے ہیں۔

دوران تلاوت میں اس تاکیدی حکم پر بارہا تمہاری نظر پڑی ہوگی لیکن شاذ ہی کبھی یہ خیال آیا ہو کہ اس کا مدعا کیا ہے؟ صبر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کے پاس ایک چیز تھی، جاتی رہی اور وہ چپ ہو گیا کہ نہیں ہے تو نہ سہی۔

کھو گیا دل کھو گیا، ہو تا تو کیا ہوتا امیر جانے دو، اک بے وفا جاتا رہا جاتا رہا

صبر سے مراد یہ ہے کہ مافات پر غم اندوہ بے سود ہے، انسان کو ہر مشکل میں مستقل مزاج رہنا چاہیے اور کوشش ہونی چاہیے کہ جو چیز جاتی رہی پھر اس کا نعم البدل مل سکے' اور جب تک بہترین صورت میں تلافی نہ ہو جائے سلسلہ سعی و تدبیر میں خلل نہ آنے پائے۔ اسی طرح صلاۃ سے بھی صرف ایک رسم کا پورا کر دینا مقصود نہیں ہے بلکہ خدا سے اپنے تعلقات کا تازہ کرنا اور موثرات دنیاوی سے کنارہ کش ہو کر نفس میں ایک اعلیٰ تصور قدسی پیدا کرنا مدنظر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی دونوں چیزیں انسانی زندگی کو کامیاب بنا سکتی ہیں۔ اور یہی کامیابی اسلام کی نظر میں ہے۔

(۵)

مدعائے نماز صلاۃ کی غرض و غایت کیا ہے؟ قرآن کریم نے خود اس کی تشریح کی ہے۔

اتل ما أوحي إليك من الكتاب، واقم الصلوٰة، ان الصلوٰة تنهى عن الفحشاء والمنكر، ولذكر الله اكبر، والله يعلم ماتصفون۔

کتاب میں سے تم پر جو وحی اتری ہے اس کو پڑھو اور صلاۃ کو درست طریق پر ادا کرو حقیقت میں صلاۃ تمام بداخلاقیوں اور برائی سے روکتی ہے۔ اور اللہ کی یاد سب سے برتر ہے اللہ تمہاری کاری گری کو خوب جانتا ہے

الفحشاء والمنکر فحشاء والمنکر سے کیا مراد ہے؟ اور ان چیزوں سے روکنے کے کیا معنی ہیں؟ اس کی یوں تفسیر کی گئی ہے۔

لہ ابو جعفر قال حدثنا القاسم قال حدثنا الحسين قال حدثني الحجاج قال ابن جريج واستعينوا بالصبر والصلاة قال انهما ...

الفحشاء ما قبح من العمل كالزنا مثلاً و المنكر ما لا يعرف في الشريعة اي تمنعه عن معاصي الله وتبعده منها، ومعنى نهيها عن ذلك ان فعلها يكون سبباً للانتهاء عنهما۔ ؂

جو قبیح کام ہوں جیسے حرام کاری۔ ان کو فحشاء کہتے ہیں، اور شرع اسلام نے جس چیز کی اجازت نہ دی ہو وہ منکر ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی نافرمانیوں سے انسان کو صلاۃ روکتی ہے اور گناہوں سے دور کر دیتی ہے، یعنی صلاۃ کا فعل یہ ہے کہ ان چیزوں سے باز رہنے کا وہ سبب ہوا کرتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ ہم نے فحشاء کا ترجمہ بداخلاقی سے کیا ہے کہ لفظ جامع ہے۔

فحشاء و منکر سے روکنے کا طریق کیا ہے؟ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

قال ابو العالية في قوله تعالى ان الصلوٰة تنهى عن الفحشاء والمنكر، قال: ان الصلوٰة فيها ثلاث خصال فكل صلاة لا يكون فيها شئ من هذه الخصال فليست صلاة، الاخلاص، والخشية، وذكر الله، فالاخلاص يامره بالمعروف، والخشية تنهاه عن المنكر، وذكر الله القرآن يامره وينهاه (ج ۷، ص ۲۹۶)

صلاۃ فحشاء و منکر سے روکتی ہے اس کی تفسیر میں ابو العالیہ کا قول ہے کہ صلاۃ میں تین خصلتیں ہیں، ان میں سے اگر کوئی خصلت بھی کسی صلاۃ میں نہ ہو تو وہ صلاۃ ہی نہیں ہے۔ وہ خصلتیں یہ ہیں: خلوص، خوف خدا، یاد الٰہی؛ خلوص کا فعل یہ ہے کہ وہ مصلی کو نیک کام کا حکم دیتا ہے، خوف خدا اسے بدی سے روکتا ہے، اور یاد الٰہی (یعنی قرآن) کا فعل امر و نہی دونوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

فحشاء و منکر سے نہ روکنے والی نماز کس حکم میں ہیں؟ امام رازی نے اس بارہ میں نہایت محققانہ جواب دیا ہے۔

؂ فتح البیان، طبع میری، ج ۷، ص ۱۶۱

الصلاۃ الصحیحۃ شرعاً تنھی عن الامرین مطلقاً، وھی التی اتی بھا المکلف للہ حتی لو قصد بھا الریاء لا تصح صلاتہ شرعا وتجب علیہ الاعادۃ (ج ۵ ص ۱۶۴)

اصول شریعت کی رو سے جو صلاۃ صحیح کہی جا سکتی ہے وہ ان دونوں امور فحشاء و منکر سے روکتی ہے۔ یہ وہی صلاۃ ہے جو ایک عاقل و بالغ مسلم خدا کے لیے ادا کرے۔ اس باب میں یہاں تک تحدید کر دی گئی ہے کہ ادائے صلاۃ سے اگر کسی کا مقصود نمائش و نمود ہو تو وہ صلاۃ شرعاً درست نہ ہوگی، اس کو دوبارہ ادا کرنا چاہیے۔

بدی سے کیا چیز روکتی ہے

بعض مفسرین کے ذوق تدقیق نے اس موقع پر ایک بات یہ بھی پیدا کی ہے کہ صلاۃ انسان کو فحشاء و منکر سے باز تو رکھتی ہے تاہم حقیقت میں یہ فعل صلاۃ کا نہیں ہے آیاتِ قرآنیہ کا ہے جن کی صلاۃ میں تلاوت کی جاتی ہے۔ اور پھر اس کی نسبت طویل بحثیں کی ہیں۔ لیکن ان سب کا حاصل نزاع لفظی اور بحث مالا ینفع سے زیادہ نہیں۔ حافظ ابن جریر نے خوب کہا ہے۔

الصواب عن القول فی ذٰلک ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر کما قال ابن عباس وابن مسعود، فان قال قائل وکیف تنھی الصلوٰۃ عن الفحشاء والمنکر ان لم یکن معنیاً بھا ما یتلی فیھا؟ قیل تنھیٰ من کان فیھا فتحول بینہ وبین اتیان الفواحش لان شغلہ بھا یقطعہ عن الشغل بالمنکر ولذٰلک قال ابن مسعود: من لم یطع صلاتہ لم یزدد من اللہ الا بُعداً وذٰلک ان طاعتہ

اس باب میں درست و صحیح قول یہی ہے کہ فحشاء و منکر سے صلاۃ ہی روکتی ہے، ابن عباس و ابن مسعود بھی اسی کے قائل ہیں، لیکن اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اگر وہ آیتیں مراد نہیں ہیں جو صلاۃ میں پڑھی جاتی ہیں تو پھر صلاۃ فحشاء و منکر سے کیوں کر روک سکتی ہے؟ جواب میں یہ کہا جائے گا کہ صلاۃ میں جو مشغول ہوگا صلاۃ اس کو روکے گی، یعنے اس کے اور فحشاء کے مابین یہ صلاۃ حائل ہو جائے گی۔ اس لیے کہ صلاۃ کا شغلہ مصلی کو شغل منکر سے منقطع کر دے گا۔ ابن مسعود نے اسی بنا پر کہا تھا کہ جس شخص نے اپنی صلاۃ کی اطاعت نہ کی

لها من مزدجر عن الفحشاء والمنكر ... من اتى فاحشة او عصى الله بما يفسد صلاته فلا شك انه لا صلاة له (ج ۲، ص ۹۲)

اسے بجز اس کے اور کوئی نفع نہ ہوا کہ جناب الٰہی سے اس کی جدائی اور بڑھ گئی، اور جو کچھ تقرب تھا اس میں کمی آگئی۔ سبب یہ ہے کہ صلاۃ کی اطاعت کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ صلاۃ اس طرح ادا کی جائے کہ جتنے ارکان، حدود، شرائط اور لوازم صلوٰۃ ہیں سب کے سب ادا ہو جائیں۔ جب یہ حالت ہوگی اور اس طرح صلاۃ کی اطاعت کی جائے گی تو اس اطاعت میں لامحالہ فحشاء و منکر سے باز رہنے اور باز رکھنے کی خصوصیت ہوگی ..... اب اگر کسی نے فحشاء کا ارتکاب کیا یا خدا کی کوئی ایسی نافرمانی کی جس سے صلاۃ میں خلل آتا ہو تو اس کی صلاۃ بے شبہ صلاۃ نہ ہوگی۔

(٦)

حقیقت الصلوٰۃ نماز کیا ہے؟ خدا کے ساتھ تعلقات بندگی کو تازہ کرنا اور قوائے بہیمیہ کے خلاف اپنے قوائے ملکوتیہ کو قوی رکھنے کی سعی ہے۔

دنیا کی جھوٹی ہستیاں جو اپنی شان و شوکت و جبروت و جلالت سے دلوں پر ایک طرح کے رعب کا نقش بٹھاتی ہیں، ان سے تبرّی و استغفار کر کے صفحۂ قلب سے نقش باطل کو دھو ڈالنا اور انسانی زندگی کو روحانی و مادی دونوں حیثیتوں سے بہترین نمونہ سعادت بنانے کے لیے حسن توفیق کا طلبگار ہونا، صلوٰۃ بندے کے لیے اللہ کی ایک معیت اور صحبت ہے۔ اگر اس کے تعلق کو صحبت و معیت کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ معیت اول سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں صرف اللہ ہے اور اللہ کی یاد ہے۔ بندے اور اللہ کے مابین کوئی چیز حائل نہیں ہوتی :-

ان الصلوٰة اولها لفظة الله واخرها لفظة الله في قوله اشهد ان لا اله

نماز کی ابتدا ”اشهد ان لا اله الا الله“ پر اور انتہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ پر ہوتی ہے، یعنی اول میں بھی

الا الله ليعلم المصلي انه من اول الصلاة الى آخرها مع الله۔

اللہ ہی کا لفظ ہے اور آخر میں بھی۔ یہ اس لیے ہے کہ نمازی کو معلوم ہو جائے کہ نماز میں اول سے آخر تک وہ اللہ ہی کے ساتھ ہے۔

فان قال قائل: فقد بقي من الصلاة قوله واشهد ان محمداً رسول الله والصلوٰة على الرسول والتسليم فنقول هذه الاشياء دخلت لمعنى خارج عن ذات الصلوٰة، وذلك لان الصلاة ذكر الله لا غير، لكن العبد اذا وصل بالصلاة الى الله وحصل مع الله لا يقع في قلبه انه استقل واستبد واستغنى عن الرسول (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۱۶۵)

اگر یہ اعتراض ہو کہ نماز میں اشہد ان محمداً رسول اللہ، اور اللّٰہم صلی علی محمد وعلی آل محمد وبارک وسلم بھی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ چیزیں اصل نماز کے معنی سے خارج ہیں۔ یہ ایک اوپری بات کے لیے داخل ہو گئی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ نماز صرف اللہ کی یاد کا نام ہے اس کے علاوہ اور کوئی کچھ نہیں لیکن نماز کے ذریعہ بندہ جب اللہ تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ کی قربت اسے حاصل ہو جاتی ہے تو اس کے دل میں یہ خطرہ نہ آنا چاہیے کہ رسول کی ہدایت سے میں آزاد ہو گیا، مستبد بن بیٹھا، اب میں تعلیمات رسالت سے بالکل ہی بے نیاز و مستغنی ہو گیا ہوں"۔

اعوذ برب الناس من هذا الوسواس الخناس۔

(۷)

ثمرات صلاۃ صلاۃ کی مواظبت سے کیا بات حاصل ہوتی ہے؟ حدیث میں ہے۔

جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: ان فلاناً يصلي بالليل فاذا اصبح سرق، فقال: ستنهاه ما تقول۔

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزارش کی کہ فلاں شخص رات کو صلاۃ میں مشغول رہتا ہے اور جب تڑکا ہوتا ہے تو چوری کرتا ہے۔ آنحضرت

علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جس چیز کو تم کہہ رہے ہو یعنی ادائے صلوٰۃ، یہی چیز اس کو اس حرکت سے روک دے گی۔

یہ بات کیوں کر حاصل ہوتی ہے اور اس کا سبب کیا ہے؟ احادیث میں اس کی جو حقیقت مذکور ہے اور آثار و اخبار سے اس موضوع پر جو روشنی پڑتی ہے! اس کا اقتباس یہ ہے۔

فی الصلاۃ منتھی و مزدجر عن معاصی اللہ۔	صلاۃ میں اللہ کی نافرمانیوں سے باز رکھنے اور روکنے کی صفت ہے۔
من لم تنھہ صلاتہ عن الفحشاء والمنکر لم یزدد بصلاتہ من اللہ الا بعدًا۔	جس شخص کو اس کی صلاۃ نے بے حیائی اور برائی سے نہ روکا وہ صلاۃ ادا کر کے اللہ سے اور بھی دور ہو گیا۔
قیل لابن مسعود: ان فلانًا کثیر الصلاۃ قال: فانھا لا تنفع الا من اطاعھا۔	عبداللہ بن مسعود سے ایک شخص کا تذکرہ ہوا کہ فلاں شخص بہت صلاۃ ادا کیا کرتا ہے۔ ابن مسعود نے کہا صلاۃ اس کو نفع دیتی ہے جو صلاۃ کی اطاعت کرے۔
من لم تامرہ صلاتہ بالمعروف و تنھہ عن المنکر لم یزدد بھا من اللہ الا بعدًا	نیکی کرنے اور برائی سے روکنے کے لیے جس کی صلاۃ حکم نہ دیتی ہو تو ایسی صلاۃ نے اللہ سے اور دوری بڑھائی
لا صلاۃ لمن لم یطع الصلاۃ وطاعۃ الصلاۃ ان تنھی عن الفحشاء والمنکر	جو صلاۃ کی اطاعت نہ کرے اس کی صلاۃ صلاۃ ہی نہیں۔ صلاۃ کی اطاعت یہ ہے کہ وہ انسان کو بداخلاقی اور برائی سے روکے۔
قال قیل لسفیان	سفیان ثوری سے پوچھا کہ
قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ قال	قرآن کریم کی اس آیت سے کیا مراد ہے کہ
فقال سفیان؟ ای واللہ. تامرہ وتنھاہ	کفار نے کہا، اے شعیب! کیا تیری صلاۃ تجھے حکم دیتی ہے۔

سفیان نے جواب دیا، ہاں، خدا کی قسم صلاۃ حکم بھی دیتی ہے اور منع بھی کرتی ہے۔

من صلی صلاۃ لم تنہہ عن الفحشاء والمنکر لم یزدد بہا من اللہ الا بعدًا ۔

جس نے صلاۃ ادا کی مگر اس صلاۃ نے بداخلاقی اور برائی سے اس کو باز نہ رکھا تو جناب الٰہی سے قرب و تعلق کی جگہ اس کا اور فاصلہ بڑھ گیا۔

من لم تنہہ صلاتہ عن الفحشاء والمنکر فانہ لا یزداد من اللہ بذلک الا بعدًا۔

جس کی صلاۃ اس کو بداخلاقی اور برائی سے مانع نہ ہوی تو بجز اس کے کہ اس صلاۃ کے سبب اللہ سے اس کی دوری بڑھ جائے، اور کوئی فائدہ نہیں ۔

معراج مومن صلاۃ انسان کی زندگی کو پاک کرنے والی، شریفانہ سیرۃ بنانے والی، تہذیب نفس و تربیت ضمیر کی روح بڑھانے والی چیز ہے ۔ یہی سبب ہے کہ اسلام نے ادائے صلاۃ پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور ہر جگہ اس کی اہمیت پر دنیا کو توجہ دلائی ہے، کسی قوم یا کسی فرد کی کامیاب زندگی کے لیے ان باتوں کی جیسی کچھ ضرورت ہے ظاہر ہے، قدرت نے مسلمانوں کو تمام دنیا پر حکومت کرنے اور ہر قسم کی روحانی و مادی ترقیات کا مجموعہ بنانے کے لیے پیدا کیا تھا۔ ترقی کا سب سے بڑا اور سب سے موثر ذریعہ سیرت اور کامل زندگی ہے، اور اس کی بہترین محرک صلاۃ ہے۔

جس صلاۃ کو تم ایک رسمی چیز سمجھ رہے ہو عہد قدیم کا ایک بیکار و بے سود رواج مانتے ہو، جس کے ادا کرنے میں تمہیں کیا کیا موانع پیش نہیں آتے، جسے پڑھتے بھی ہو تو :

برزبان تسبیح و در دل گاؤ خر

کا حال ہوتا ہے، وہی صلاۃ ایسی چیز تھی کہ اگر اس کی حقیقت پر تمہیں عبور ہوتا تو اس وقت تمہاری حالت بدلی ہوئی نظر آتی، اور تم یوں مقہور و مغلوب نہ ہوتے ۔ کیوں کہ تم میں سے ہر فرد ایک ایسا اعلیٰ اور مکمل اخلاقی نمونہ رکھتا جو دنیا میں صرف عزت و عظمت، ہیبت و جبروت، حکومت و فرمانروائی اور طاقت و طاقت فرمائی ہی کے لیے ہے ۔

که کار من چنیں بودے ازچناں بودے

غور کرو جو صلاۃ تم ادا کرتے ہو کیا یہ وہی صلاۃ ہے جس کی نسبت حضرت فاروق اعظم نے ایک بے خودانہ لہجے میں فرمایا تھا: لاحظ فی الحیاۃ و قد عجزت من اقامۃ الصلوٰۃ۔ (ادائے صلاۃ ہی کی استطاعت نہ رہی تو پھر زندگی میں کیا لطف رہا؟)

(۸)

صلاۃ وسطی ایک خاص صلاۃ کی تحقیق بھی اسی ذیل میں ضروری ہے جس کی تعیین و تحدید کا سوال ایک نہایت معرکۃ الاراء [illegible] بن گیا ہے، اور جس نے اصل صلاۃ کے متعلق عجیب عجیب مباحث پیدا کر دیے ہیں یعنی صلاۃ وسطی جس کے لیے قرآن کریم نے خاص طور پر تاکید کی ہے:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلوٰةِ الْوُسْطٰى — محافظت کرو صلاۃ کی اور علی الخصوص صلاۃ وسطی کی۔

یہ کونسی نماز ہے صلاۃ وسطی کس صلاۃ کا نام ہے؟ علمائے تفسیر و حدیث کے متعدد قول اس باب میں ہیں

عصر صلاۃ وسطی عصر کی صلاۃ ہے، اس کی تائید میں ۶۹ حدیثیں مروی ہیں جن میں ایک خاص حدیث واقعہ احزاب کے متعلق ہے اور بقول حافظ ابو جعفر یہی حدیث تخصیص عصر کی علۃ العلل ہے۔

شغل المشرکون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن صلاۃ العصر حتی اصفرت او احمرت فقال شغلونا عن الصلاۃ الوسطی ملأ اللہ اجوافھم وقبورھم نارا

مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ میں اتنا مشغول کر لیا کہ صلاۃ عصر ادا کرنے کی مہلت نہ ملی حتی کہ آفتاب کا رنگ زرد یا سرخ ہو گیا (یعنی غروب آفتاب کا وقت آگیا) اس حالت میں آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا: اللہ ان کے سینے اور ان کی قبریں آگ سے بھر دے، انہوں نے ہم کو صلاۃ وسطی سے روک رکھا۔

ظہر صلاۃ وسطی ظہر کی صلاۃ ہے، اس کی تائید میں ۲۶ حدیثیں مروی ہیں جن میں

تخصیصِ ظہر کی علۃ العلل دو حدیثیں ہیں:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی الظہر بالھاجرۃ ولم یکن یصلی صلاۃ اشد علی اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم منھا، قال: فنزلت حافظوا علی الصلات والصلوۃ الوسطی، وقال ان قبلھا صلاتین وبعدھا صلاتین۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلاۃ ظہر دوپہر ڈھلتے ہی ادا فرماتے تھے، آپ جتنی نمازیں ادا فرماتے تھے اُن میں اس سے زیادہ اور کوئی صلاۃ صحابہ پر گراں نہ تھی، اسی بنا پر یہ آیت اتری کہ نمازوں کی اور نماز وسطیٰ کی محافظت کرو، راوی حدیث (زید بن ثابت) نے اسکے وسطیٰ ہونے کی یوں بھی توجیہ کی

ہے کہ ظہر سے قبل و بعد دو دو نمازیں ہیں، پس ظہر وسط میں ہے۔

عشاء | صلاۃ وسطیٰ صلاۃ عشاء ہے۔ اس کی تائید میں خصوصیت کے ساتھ اس حدیث سے مدد لی جاتی ہے:

عن عثمان بن عفان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من صلی العشاء الآخرۃ فی جماعۃ کان کقیام نصف لیلۃ	عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جس نے صلاۃ عشاء جماعت کے ساتھ ادا کی اس کی صلاۃ نصف شب تک کی عبادت سمجھی جائے گی۔

از روئے عقل اس کے وسطیٰ (درمیانی) ہونے کی یہ علت بھی بیان کی جاتی ہے۔

انما توسط بین صلاتین تقصران: المغرب والصبح (غرائب القرآن، ج ۲، ص ۳۶۵)	صلاۃ عشاء مغرب و فجر کی دونوں چھوٹی چھوٹی نمازوں کے مابین متوسط درجہ کی صلاۃ ہے۔

فجر | صلاۃ وسطیٰ صلاۃ فجر ہے۔ اس کی تائید میں ۷ حدیثیں مذکور ہیں، جن میں سے ایک خاص حدیث یہ ہے:

عن ابن عباس انہ صلی صلاۃ الغداۃ
فی مسجد البصرۃ فقنت قبل الرکوع وقال:
ھذہ الصلاۃ الوسطی التی ذکرھا اللہ
حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطی
وقوموا للہ قانتین ۔

بصرہ کی مسجد میں عبداللہ بن عباس نے صبح کی نماز
ادا کی جس میں رکوع سے پہلے دعاء قنوت پڑھی
اور فرمایا کہ صلاۃ وسطی یہی ہے جس کی نسبت اللہ
تعالیٰ نے تذکرہ کیا ہے کہ نمازوں کی اور نماز وسطی
کی محافظت کرو اور اللہ کے لیے قنوت کرتے ہوئے کھڑے رہو۔

حافظ ابن جریر لکھتے ہیں :-

وعلۃ من قال ھذہ المقالۃ ان اللہ
تعالی ذکرہ قال: حافظوا علی الصلوات
والصلوۃ الوسطی وقوموا للہ قانتین۔
قال فلا صلاۃ مکتوبۃ من الصلوات
الخمس فیھا قنوت سوی صلاۃ الصبح
فعلم بذلک انھا ھی دون غیرھا (ج ۲ ص ۳۵۰)

جن لوگوں کا قول ہے کہ صلاۃ وسطی فجر کی نماز ہے
وہ اس بنا پر یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے
کہ "نمازوں اور نماز وسطی کی حفاظت کرو" اور
اللہ کے لیے قنوت کرتے ہوئے کھڑے رہو"۔ پس وہ کھڑے
ہونے کے معنی عبادت کرنے اور قنوت کرنے کا مطلب
نماز میں دعائے قنوت پڑھنا سمجھتے ہیں اور صلاۃ پنج
گانہ میں صلاۃ فجر کے علاوہ کوئی ایسی صلاۃ نہیں جس میں دعائے قنوت پڑھی جاتی ہو لہذا معلوم ہوا
کہ صلاۃ وسطی جس کے ساتھ قنوت کی شرط ہے فجر ہی کی نماز ہے کوئی اور نماز نہیں۔

پانچ میں ایک (د) صلاۃ وسطی یہ تو معلوم نہیں کہ کون سی صلاۃ ہے مگر ہے انہی پانچوں نمازوں میں سے کوئی
ایک، اس کی تائید میں تین حدیثیں روایت کی گئی ہیں، جن میں دو یہ ہیں:

کنا عند نافع ومعنا رجاء بن حیاۃ،
فقال لنا رجاء سلوا نافعا عن
الصلوۃ الوسطی فسألناہ، فقال قد

ہم لوگ نافع کے پاس بیٹھے تھے اور ہمارے ساتھ رجاء
بن حیاۃ بھی تھے۔ رجاء نے کہا کہ نافع سے پوچھو
کہ صلاۃ وسطی کون سی صلاۃ ہے؟ چنانچہ ہم نے ان

سأل عنها عبداللہ بن عمر رجل فقال ھی فیھن فحافظوا علیھن کلھن

سے سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ عبداللہ بن عمر سے بھی ایک شخص نے یہی سوال کیا تھا، جواب میں ابن عمر نے فرمایا کہ انہی پانچ نمازوں میں ایک نماز یہ بھی ہے، پس تم سب کی محافظت کرو۔

دوسری حدیث میں ہے:۔

عن ابی قطیعہ قال فسألت الربیع بن خیثم عن الصلوٰۃ الوسطیٰ، قال: أرأیت ان علمتھا وکنت محافظا علیھا وضیعا سائرھن؟ قلت لا، فقال فانک ان حافظت علیھن فقد حافظت علیھا

ابو قطیعہ کہتے ہیں کہ میں نے ربیع بن خیثم سے صلاۃ وسطیٰ کی نسبت دریافت کیا۔ انہوں نے کہا اگر تمہیں پتہ معلوم ہو جائے تو کیا صرف اسی ایک نماز کی محافظت کروگے اور بقیہ نمازیں چھوڑ دوگے؟ میں نے کہا نہیں، اس پر انہوں نے فرمایا کہ اگر تم نے ان سب نمازوں کی محافظت کی تو اس کی محافظت بھی کر لی۔

پنجگانہ صلاۃ وسطیٰ ان پانچوں صلاتوں کے مجموعہ ہی کا نام ہے اس کی تائید میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے:۔

ان الوسطیٰ مجموع الصلوات الخمس فان الایمان بضع وسبعون درجۃ اعلاھا شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وادناھا اماطۃ الاذی عن الطریق والصلوات المکتوبۃ واسطۃ بین الطرفین۔ (غرائب القرآن ج ۲ ص ۲۹۳)

حقیقت میں نماز وسطیٰ سے مراد اوقات پنجگانہ کی نمازوں کا مجموعہ ہے، اس لیے کہ حسب روایت صحیحہ ایمان کے کچھ اوپر ستر درجے ہیں جن میں اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی معبود کے نہ ہونے کی شہادت دی جائے اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ راستے سے اذیت کی چیزیں ہٹا دی جائیں، فرض نمازوں کا درجہ ان دونوں کے درمیان ہے اور یہ ان دونوں کناروں کے لیے باہم ملنے کی جگہ ہے یہی وسط ہے۔

(۹)

وسطیٰ کے معنی | صلاۃ وسطیٰ میں لفظ وسطیٰ کے معنی کیا ہیں؟ علمائے لغت و محققین ادبیات کا بیان ہے:

الوسطى تانيث الاوسط واوسط الشئ ووسطه خياره، ومنه قوله تعالى وكذلك جعلناكم امة وسطاً۔ ووسط فلان القوم يسطهم اى صار فى وسطهم وليست من الوسط الذى معناه متوسطة بين شيئين لان فعلى معناها التفضيل الا مما يقبل الزيادة والنقص والوسط بمعنى العدل والخيار يقبلها بخلاف التوسط بين الشيئين فانه لايقبلها فلا يبنى منه افعل التفضيل۔ (فتح البيان ج ۱، ص ۳۱۵)

وسطیٰ لفظ اوسط کا صیغۂ مونث ہے محاورے میں کہتے ہیں اوسط الشئ ووسط الشئ (کسی شے کا اوسط اور اس کا وسط) اور اس سے مراد لیتے ہیں خیار الشئ (بہترین چیز) اوسط وسط سے تو مشتق ہے مگر اس وسط سے مشتق نہیں ہے جس کے معنی دو چیزوں کے درمیانی حصے کے آتے ہیں۔ اس لیے کہ فُعلیٰ جس کے وزن پر "وسطیٰ" کا لفظ ہے اس کے معنی تفضیل یعنی زیادتی کے ہیں اور تفضیل کے لیے وہی لفظ لائیں گے جو زیادتی وکمی دونوں حیثیتوں کو قبول کرسکتا ہو، وسط جس کے معنی معتدل اور بہتر کے ہیں، ان دونوں (یعنی زیادتی وکمی) کی قابلیت رکھتا ہے (یعنی بصورت زیادت اعتدال بہتری اور بحالت نقص بے اعتدالی وبدتری کی گنجائش بھی اس میں نکل سکتی ہے) بخلاف اس توسط کے جس سے دو چیزوں کا درمیانی حصہ مراد ہو، کیوں کہ اس میں دوسرا پہلو آسکتا ہی نہیں لہذا صیغۂ افعل التفضیل اس سے بہر نہیں بنا سکتے

یعنی جن روایتوں کی بنا پر صلاۃ وسطیٰ کے لیے اوقات پنج گانہ میں سے کسی ایسی صلاۃ کی تحدید کی جاتی ہے جو تمام نمازوں کے درمیان واقع ہو، یہ تخیل ہی تخیل ہے۔ وسطیٰ کے یہ معنی ہی نہیں ہیں اس تحقیق کی تائید میں کہا گیا ہے کہ و (والعطف تقتضی المغایرۃ) (واو عطف کا

اقتضا یہ ہے کہ معطوف و معطوف علیہ دونوں دو علیحدہ چیزیں ہیں، پس حافظوا علی الصلوات والصلاۃ الوسطیٰ میں واو عطف موجود ہے، لہٰذا صلوٰۃ سے جو نمازیں مراد ہیں، ان کی ذیل میں صلاۃ وسطیٰ کیوں کر آسکتی ہے؟ لامحالہ اسے کوئی دوسری نماز فرض کرنا پڑے گا۔

یہ شبہہ اگر صحیح ہے تو وہ روایتیں جو اوقات پنجگانہ کی نمازوں میں سے کسی ایک نماز کو وسطیٰ شمار رہی ہیں، یقیناً غلط ماننی پڑیں گی صلاۃ وسطیٰ کو فرائض خمسہ کے علاوہ ایک دوسری صلاۃ ماننا ہوگا اور تحقیق و بحث کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

لیکن اس کا جواب دیا گیا ہے کہ ہر واو کو واو عطف مان لینا ہی غلط ہے واؤ کی ایک قسم واو زائدہ بھی ہے جس کی متعدد مثالیں خود قرآن کریم میں موجود ہیں، مثلاً۔ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ۔ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۔

خود عطف میں بھی جہاں ایک قسم عطفِ وصفی کی ہے جس میں معطوف و معطوف علیہ میں مغائرت ضروری ہے، وہاں ایک دوسری قسم عطفِ ذاتی کی بھی ہے جسے اس تفریق سے کچھ سروکار نہیں آیتوں میں عطفِ ذاتی کی بکثرت نظیریں وارد ہیں، مثلاً وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى، الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى، وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى۔

ان مثالوں میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جسے مغائرت کے ثبوت میں پیش کر سکیں۔ یہ سب عدم مغائرت کے لیے ہیں۔

عرب کا ایک قدیم شعر ہے۔

الی الملک القرم وابن الہمام　　ولیث الکتیبۃ فی المزدحم

یہاں کہیں بھی مغائرت نہیں ہے :

ابن ابی داؤد ایادی کے مشہور قصیدہ میں ہے :

سلط الموت والمنون علیھم فلھم فی صدی المقابر ھام

موت اور منون کے درمیان واو عطف سے تفریق کی ہے لیکن معنی دونوں کے ایک ہیں۔

ارض حیرہ کا نامور شاعر اور نعمان بن منذر کا سرپرست عدی بن زید عبادی ایک قصیدے میں کہتا ہے :

فقدمت الادیم الراھشیہ فالفیٰ قولھا کذباً ومینا

"کذب" اور مین دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔

فارسی میں بھی یہی قاعدہ ہے، فردوسی کا شعر ہے :۔

وراز جوے خلاش ہنگام آب بہ بیخ انگبین ریزی وشہد ناب

انگبیں اور شہد دونوں دو چیزیں نہیں ہیں۔

سیبویہ کا قول ہے۔

یجوز قول القائل مررت باخیك وصاحبك، ویکون الصاحب ھو الاخ نفسہٗ	یہ کہنا جائز و درست ہے کہ میں تیرے بھائی اور تیرے رفیق کے پاس سے گذرا، خواہ جس کو رفیق کہا گیا ہو وہی بھائی ہو، یعنی دونوں ایک ہوں، دو نہوں۔

(۱۰)

قنوت کے کیا معنی ہیں؟ اس مسئلہ میں بھی متعدد اقوال ہیں :۔

سکوت | قُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ میں قنوت کے معنی سکوت و خاموشی کے ہیں، اس باب میں ۹ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے :

عن ابن مسعود، قال: كنا نقوم في الصلاة فنتكلم ويسأل الرجل صاحبه عن حاجته ويخبره ويردون عليه اذا سلم، حتى اتيت انا فسلمت فلم يردوا علي السلام فاشتد ذلك علي فلما قضى النبي صلى الله عليه وسلم قال: انه لم يمنعني ان ارد عليك السلام الا انا امرنا ان نقوم قانتين لا نتكلم في الصلاة، والقنوت السكوت

ہم لوگ صلاۃ میں باتیں کیا کرتے تھے، لوگ اپنے ساتھی سے اپنی حاجت کے متعلق سوال کرتے اور وہ انھیں جواب دیتا، اور سلام کرنے والے کو اسکے سلام کا جواب دیا جاتا یہی کیفیت روزمرہ تھی کہ ایک مرتبہ میں حاضر ہوا، نماز ہو رہی تھی، میں نے سلام کیا، جواب نہ ملا، مجھ پر یہ واقعہ بہت ہی گراں گزرا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا: جواب سلام سے مجھے صرف اس بات نے روکا کہ ہمیں حکم ہوا ہے کہ قنوت کے ساتھ عبادت کریں، صلاۃ میں نہ بولیں" پس قنوت کے معنی خاموشی کے ہیں۔

خشوع | قنوت کے معنی خشوع وخضوع کے ہیں۔ اس باب میں پانچ حدیثیں مروی ہیں جن میں ایک یہ ہے

ان من القنوت الخشوع وطول الركوع وغض البصر وخفض الجناح من هيبة الله كان العلماء اذا قام احدهم يصلي يهاب الرحمان ان يلتفت او ان يقلب الحصى او يعبث بشيء او يحدث نفسه بشيء من امر الدنيا الا ناسيا

قنوت کے ذیل میں خشوع، طول رکوع، نظر نیچی رکھنی، اللہ کے خوف سے متواضع رہنا، یہ سب باتیں داخل ہیں علمائے صحابہ کی عادت تھی کہ جب ان میں کوئی نماز پڑھنے اٹھتا تو اللہ کی اتنی ہیبت اس پر چھا جاتی کہ نہ ادھر ادھر التفات کرتا نہ کنکریاں الٹتا پلٹتا نہ کوئی بیکار شغل کرتا نہ دنیا کی کسی بات کو جی میں لاتا اور اگر لاتا تو بھولے سے لاتا۔

دعائے قنوت | قنوت سے مراد دعائے قنوت ہے۔ اس کی تائید میں ابن عباس کی روایت پہلے نقل ہو چکی ہے۔

اطاعت | قنوت کے معنی اطاعت کے ہیں۔ اس باب میں ۲۴ حدیثیں مروی ہیں، جن میں سے اکثر کے راوی ثقہ ہیں، اور ادبیات عرب سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، حافظ ابن جریر لکھتے ہیں

اولی هذه الاقوال بالصواب فی تاویله مطیعین، وذلك ان اصل القنوت الطاعة، وقد تکون الطاعة لله فی الصلوة بالسکوت عما نهی الله من الکلام فیها، ولذلك وجه من وجه تاویل القنوت فی هذا الموضع الی السکوت فی الصلوة احد المعانی التی فرضها الله علی عباده فیها الا عن قراءة قرآن او ذکر له بما هو اهله..... وقد تکون الطاعة لله فیها بالخشوع وخفض الجناح واطالة القیام وبالدعاء لان کلا غیر خارج من احد معنیین من ان یکون مما امر به المصلی اومما ندب الیه والعبد بکل ذلك لله مطیع وهو لربه فیه

"اللہ کے لیے قنوت کرتے ہوئے عبادت کرو" اس کی تفسیر میں جو اقوال مذکور ہیں ان میں سے زیادہ درست اور بہتر یہ تاویل ہے کہ قنوت کرنے کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ قنوت اصل لغت میں اطاعت و فرمانبرداری ہی کے لیے موضوع ہے، صلاۃ میں اللہ کی اطاعت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ خاموش رہے، جن باتوں میں اللہ نے گفتگو کرنے کی ممانعت کی ہے ان میں کلام نہ کرے، آیت میں جو لوگ قنوت کے معنی سکوت لیتے ہیں اس تاویل کی ایک شکل وہ بھی ہے۔ اللہ نے بحالت صلاۃ بندوں پر سکوت بھی فرض ٹھیرایا ہے۔ البتہ قراءت قرآن یا وہ اذکار جو اللہ کے شایان شان ہیں اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں ...... صلاۃ میں اطاعت الٰہی کی ایک دوسری صورت خشوع وخضوع وطول و قیام و دعا بھی ہے۔ یہ تمام چیزیں دو باتوں سے

قانتین القنوت اصله الطاعة لله ثم یستعمل فی کل ما اطاع الله العبد... فتاویل الآیة اذا حافظوا علی الصلوات والصلاة الوسطی وقوموا لله فیها مطیعین ..... غیر عاصین لله فیها بتضییع حدودها والتفریط فی الواجب علیکم فیها فی غیرها من فرائض الله (ج ۲، ص ۳۵۴)

خالی نہیں۔ یا تو مصلی کو اس کا حکم ملا ہے یا اس کو مستحب ٹھیرایا گیا ہے، دونوں حالتوں کی اطاعت میں بندہ اللہ کی اطاعت اور قنوت کرنے والا سمجھا جائیگا۔ قنوت کی حقیقت بھی اللہ کی اطاعت ہے بعد کو ان تمام اشکال کو بھی قنوت کہنے لگے جن کے ذریعے اللہ کی اطاعت کی جائے...... اس صورت میں آیت کی تفسیر یہ ہوئی کہ نمازوں کی اور نماز وسطی کی حفاظت کرو اور ان عبادتوں میں اللہ کی اطاعت کیا کرو...... حدود وطاعت کو تلف کرکے نافرمان نہ ہو نمازوں میں اور دوسرے فرائض وواجبات میں جو امور اللہ نے تم پر لازم ٹھیرائے ہیں ان میں کمی نہ ہونے دو۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

وعن مجاهد قال من القنوت الرکوع والخشوع وطول القیام وغض البصر وخفض الجناح والرهبة لله۔ (۱۳۸)

مجاہد سے روایت ہے کہ آیت میں قنوت سے مراد رکوع بھی ہے، خشوع بھی ہے، طول قیام بھی ہے، چشم پوشی اور نیچی نظر رکھنا بھی ہے، تواضع بھی ہے، اور خوف خدا بھی۔

پھر قنوت کے معنی میں سکوت کو ترجیح دی ہے اور یہ بھی تشریح کی ہے کہ نماز میں سکوت عن کلام الناس مقصود ہے، مطلق سکوت مقصود نہیں لان الصلوٰة لا صمت فیها بل جمیعها قرآن وذکر (نماز میں خاموشی کیسی؟ اس میں تو تمام تر قرآن ہی قرآن ہے اللہ ہی کی یاد ہے)

(۱۱)

مہمات صلاۃ حقیقت یہ ہے کہ صلاۃ میں سب سے بڑی مہم اطمینان قلب وحضور نفس وخشوع طبیعت وخضوع جوارح ہے کہ انسان اپنے تمام اعضاء اور تمام قویٰ وجذبات سے اللہ کی جانب متوجہ ہو جائے اور یہ

اغراض کے لیے صلاۃ کی تاکید کی گئی ہے ان کو نہایت کمل طریق پر بجا لائے، حدیث میں ہے:

خمس صلوٰت افترضهن الله تعالیٰ من احسن وضوءهن وصلاهن لوقتهن و اتم رکوعهن وخشوعهن کان له علی الله عهد ان یغفر له ومن لم یفعل فلیس له علی الله عهد ان شاء غفر له وان شاء عذبه۔

اللہ نے پانچ نمازیں فرض ٹھیرائی ہیں، جس نے اچھی طرح وضو کیا، وقت پہ نماز پڑھی اور کامل طریق پر رکوع وخشوع کے حقوق سے ادا ہوا تو اللہ کا وعدہ ہے کہ ضرور اس کی مغفرت ہوگی لیکن جس نے ایسا نہ کیا تو کوئی وعدہ نہیں، چاہے اللہ اس کو بخش دے اور چاہے عذاب میں ڈالے۔

تکمیل صلاۃ | یہی وہ صلاۃ ہے جسے کامل طریق پر ادا ہوتے دیکھکر ایک شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ٹوکتے رہے۔ اس نے کئی مرتبہ نماز پڑھی مگر ہر مرتبہ آنحضرت علیہ السلام نے یہی ارشاد فرمایا: قم فصل فانك لم تصل (اٹھو اور پھر نماز پڑھو، اس لیے کہ جو نماز تم نے پڑھی ہے وہ نماز ہی نہ تھی۔ رواہ البخاری ومسلم عن ابی هریرة. قال: ان رجلا دخل المسجد ورسول الله صلی الله علیه وسلم جالس...)

حد تکمیل | وہ نماز جو انسان میں ایک ذرہ برابر اشراق و نورانیت نہ پیدا کر سکے، وہ خواہ کسی وقت کی نماز ہو۔ گر اس میں صلاۃ وسطیٰ کا درجہ کیونکر آسکتا ہے؟ روزمرہ جو نمازیں فرض ہیں یہی صلاۃ وسطیٰ بھی ہیں بشرطیکہ ہر ایک شرط کی تکمیل پر نظر ہو، صلاۃ کے اغراض و مقاصد ان سے حاصل ہو سکیں، قلب میں طہارت پیدا ہو، دلوں میں نورانیت کا ظہور رہو، روحانیت بڑھے، نفس میں تہذیب کے خصائل بلند ہوں، اور انسان اس قابل ہو سکے کہ جب نماز پڑھے تو ملکوت السمٰوٰت والارض کے اسرار اس پر افشا ہو جائیں: لو کشف الغطاء لما ازددت یقینا (قدرت کے تمام پردے اگر کھل جائیں جب بھی میرا یقین اس درجہ بلند ہے کہ اس میں کوئی اضافہ نہ ہو سکے گا)۔ علمائے حقیقت لکھتے ہیں:

القلب هو الذی فی وسط الانسان بین الروح والجسد فکانه قیل: حافظوا علی صورة الصلوات بشرائطها حافظوا علی معانی الصلوات بحقائقها بدوام شهود القلب للرب صلاة وبعدها (نیسابوری ج ۲، ص ۳۶۵)

قلب وہ چیز ہے جو شرف مرتبت و شرف محل، ہر حیثیت سے انسان کے وسط جسم میں واقع ہے یہ روح اور جسم میں ٹھیک درمیان کی حالت رکھتا ہے، گویا صلاۃ وسطیٰ کی محافظت کا حکم دیتے ہوئے یہ کہا گیا کہ صورت صلاۃ کی محافظت کرو شرائط صلوٰۃ کی محافظت کرو، معانی و اغراض صلاۃ کی محافظت کرو حقیقت و حکمت صلاۃ کی محافظت کرو، اور یہ محافظت اس طرح کرو کہ صلاۃ میں اور صلاۃ کے بعد ہر حالت میں قلب کو بطریق دوام و استمرار پروردگار عالم کا شہود حاصل رہے ۔

صلاۃ وسطیٰ وہی نماز ہوگی جو فضل و شرف میں سب پر فائق ہو ایسی نماز جو دینی و دنیوی ہر قسم کی ترقیوں کی بہترین تحریک اپنے اندر رکھتی ہو، اس کی فضیلت میں کیا کلام ہو سکتا ہے ؟ یہی نمازیں ہیں جن کو قرآن کریم کی اصطلاح میں وسطیٰ کا لقب دیا گیا اور ان کی محافظت کی تاکید کی گئی تاکہ انسان اس طریق پر زمانہ بھر کی نعمتوں اور برکتوں کا احاطہ کر سکے، اس کے تفوق کی سارے عالم پر حکومت ہو

(۱۲)

اس تمام مذکور کا ماحصل یہ ہے :-

۱۔ صلاۃ و اجزائے صلاۃ سے محض خشوع و خضوع و طہارت نفس مقصود ہے ۔

۲۔ صلاۃ وہی ہے جو اپنے اندر معنویت رکھتی ہو ایسی صلاۃ سے انسان کی ہر مشکل آسان ہو سکتی ہے ۔

۳۔ صلاۃ کا مفاد یہ ہے کہ فواحش و منکرات سے روکے اور انسان کی زندگی کو پاک اور

ستھرا بنانا ہے۔

۴۔ مواظبت صلاۃ سے انسان درست ہوتا ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں تقرب بڑھتا ہے اور اس درجہ بڑھتا ہے کہ دنیا کی تمام جھوٹی ہستیاں ہیچ نظر آنے لگتی ہیں۔

۵۔ وہ صلاۃ جو ان اوصاف کی جامع ہو، شریعت کی اصطلاح میں وہی صلاۃ وسطیٰ ہے۔ حدیثوں پر تدبر کرو جب کسی صلاۃ کا وقت نہ رہا تو یہی شکایت ہوئی کہ صلاۃ وسطیٰ جاتی رہی، یعنی اب وقت میں اتنی گنجائش باقی نہیں کہ تمام حدود و شرائط کے ساتھ یہ صلاۃ ادا کی جاسکے جس صلاۃ میں کوئی شان فضیلت دیکھی اسی کو وسطیٰ سمجھ لیا کہ تعمیم صلاۃ میں تخصیص فضیلت صلاۃ وسطیٰ ہی کے لیے ہے۔

۶۔ صلاۃ وسطیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ معتدل ہو، اس لیے مغرب و ظہر و عشاء وغیرہ نمازوں کو وسطیٰ کہنے لگے تھے۔

۷۔ صلاۃ وسطیٰ کے لیے دعائے قنوت مشروط نہیں ہے، قنوت البتہ مشروط ہے جس کے معنی خضوع و سکوت کے ہیں۔

۸۔ صلاۃ وسطیٰ کے لیے وسط میں ہونا ضروری ہے کہ افراط و تفریط نہ ہونے پائے (یعنی اول وقت اور آخر وقت کے درمیان متوسط وقت میں پڑھی جائے) تمام نمازوں کے وسط میں ہونا ضروری نہیں، اور نہ یہ ضروری ہے کہ اوقات خمسہ کے علاوہ یہ کوئی مستقل اور جداگانہ صلاۃ ہو،

۹۔ صلاۃ وسطیٰ کی محافظت لازم ہے، نہ اس لیے کہ ایک رسم پوری ہو بلکہ اس لیے کہ ان میں مواظبت صلاۃ سے وہ خصوصیت پیدا ہو کہ سارے جہان کو چھائے اور ہر جگہ اسی کی حکومت ہو۔

بہ یک سجود سماوات را کند تسخیر ‏ بدیں مثابہ حضور نماز میخواہم

(۱۴)

حدیثیں مقدس ہیں اجتہاد صحابہ محترم ہے، تعامل سلف صالح مطاع ہے، اور احداث فی الدین

بہرحال بدعت ہے، اعاذنا اللہ منہا۔ صلاۃ وسطیٰ کی تفسیر میں جو احادیث و آثار ہیں وہ سب ناقابل انکار ہیں مگر انھیں میں ایک وہ مذہب بھی ہے جس کی تحقیق ابھی آپ سن چکے، جامع صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانی، باب حافظوا علی الصلاتُ والصلوٰۃ الوسطیٰ کی تشریح فرماتے ہیں کہ الوسطیٰ هي تانيث الاوسط والاوسط الاعدل من كل شئ (ج ۸۔ صـ ۱۳۲، طبع خیریۃ مصر ۱۳۲۶ھ)

حافظ دمیاطی نے اپنی مشہور تالیف کشف الغطا عن الصلاۃ الوسطیٰ میں صلاۃ وسطیٰ کے متعلق انیس مذاہب بیان کئے ہیں صـ ۱۳۵ جن میں پانچویں مذہب کے متعلق لکھتے ہیں:۔

هو اخر ما صححه ابن ابي حاتم اخرجه ايضا باسناد حسن عن نافع قال سئل ابن عمر فقال هي كلهن فحافظوا عليهن وبه قال معاذ بن جبل واحتج له بان قوله حافظوا على الصلوٰت يتناول الفرائض والنوافل فعطف عليه الوسطى واريد بها كل الفرائض تاكيدا لها، واختار هذا القول ابن عبد البر (صـ ۱۳۶)

یعنی یہ وہ مذہب ہے جس کی تصحیح ابن ابی حاتم نے سب کے آخر میں کی ہے اور باصطلاح محدثین اسناد حسن کے ساتھ نافع سے روایت کی ہے کہ عبد اللہؓ بن عمرؓ سے صلاۃ وسطیٰ کی نسبت دریافت کیا گیا انھوں نے جواب دیا کہ پانچوں فریضے وسطیٰ ہیں، ان سب کی حفاظت کرو، معاذ بن جبلؓ کا بھی یہی قول ہے ابن ابی حاتم نے استدلال کیا ہے کہ "نمازوں کی حفاظت کرو" یہ فرائض و نوافل سب پر شامل ہے۔ وسطیٰ اس پر معطوف ہے جس سے تمام فرائض مراد ہیں۔ اور یہ تاکید کے لئے ہے۔ حافظ ابن عبد البر بھی اسی کو قول مختار کہتے ہیں۔

آخر میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ حفظ صلاۃ کی تاکید میں حفظ سے مراد تفقّد و تعہّد و رعایت حدود و مراعاتِ اوقات و ارکان و قیام علی غایت ما یکون ہے۔

سُورۃ البقر

از

مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی

ترجمان القرآن میں تبذل تنزیل وتاویل سورۃ البقرہ کی تفسیر شروع کی گئی تھی، دو اشاعتوں کے بعد مولانا کے سفرحج کو جانے کے سبب اس کا سلسلہ رک گیا' اب پھر اس کا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے۔

بِالْغَیْبِ۔ یعنی جو چیزیں ان کی عقل اور حواس سے پوشیدہ ہیں جیسے جنت وجہنم اور ملائکہ وغیرہ وغیرہ۔ صرف اللہ اور اس کے رسول کے فرمانے سے ان کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کو حق جانتے ہیں اور جو لوگ ان امور غیبیہ کے منکر ہیں وہ سراسر ایمان اور ہدایت سے محروم ہیں اور ان کی ایسی ہی مثال ہے

؎ چوآن کرمے کہ در سنگے نہان است زمین و آسمان او ہمہ است

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ لفظ غیب سے وہ امور مراد ہیں کہ جن کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے حدیث جبرئیل میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ عزّ وجل ۔ ملائکہ ۔ کتب الہیہ۔ رُسُل۔ یوم آخرت قضا و قدر۔ کتاب اور رسول اگرچہ ظاہر کے لحاظ سے غیب نہ ہوں لیکن اس اعتبار سے کہ کتاب کا منزل من اللہ ہونا اور پیغمبر کا مُرسَل من اللہ اور فرستادہ خدا ہونا ایک غیبی امر ہے۔ اس اعتبار سے کتب اور رُسل ضرور غیب میں داخل سمجھے جائیں گے۔ اور صحابہ کرام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ایمان بالغیب ہی کہلائے گا۔ اس لیے کہ ذات رسول اگرچہ محسوس اور مشاہد ہے مگر وصف رسالت اور اُس کا فرستادہ خدا ہونا یقیناً غَیْب ہے۔ اور ایمان کا اصل تعلق

اسی وصف رسالت کے ساتھ ہے۔

بعض اہل علم نے غیب اور غائب میں فرق تبلایا ہے۔ وہ یہ کہ

الغائب مالا یراك ولا تراہ۔ والغیبُ　　غائب وہ ہے کہ وہ تجھکو دیکھے اور نہ تو اس کو دیکھے

مالا تراہ انت　　اور غیب وہ ہے کہ تو اس کو نہ دیکھتا ہو۔

اسی وجہ سے حق تعالیٰ شانہٗ پر غیب کا اطلاق آسکتا ہے۔ غائب کا اطلاق درست نہیں۔ اس لیے

کہ وہ ہر شی کو دیکھتا ہے۔ کوئی شی اُس کی بے چون وچگون بصر سے مخفی اور پوشیدہ نہیں۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوۃَ۔ اور قائم اور درست رکھتے ہیں نماز کو یعنی اس کو خشوع اور خضوع اور

اس کے تمام اداب کیساتھ اس کو بجالاتے ہیں سورۂ لقمان میں ہے۔

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ　　ہدایت اور رحمت ہے ان نیکی کرنے والوں کے لیے

الصَّلٰوۃَ　　جو نماز کو قائم کرتے ہیں۔

اس آیت شریف میں یقیمون الصلوۃ کو المحسنین کی صفت گردانا ہے۔

غالباً جبرئیل امین نے نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام سے ما الاحسان (احسان کیا چیز ہے) کہکر اسی

احسان کی حقیقت دریافت کی ہے کہ جو آیت موصوفہ میں مذکور ہے جس کا جواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

بدین الفاظ ارشاد فرمایا۔

ان تعبد اللہ کانك تراہ فان لم تکن　　یعنی نماز اور عبادت کا احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی

تراہ فانہٗ یراك۔　　اس طرح عبادت کرے کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے۔

اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہی خیال رکھ کہ وہ رب العزۃ تجھکو دیکھ رہا ہے قال تعالیٰ۔

الم یعلم بان اللہ یری　　کیا نہیں جانتا کہ اللہ اس کو ہر وقت دیکھ رہا ہے۔

یقیمون الصلوۃ سے اسی قسم کی نماز مراد ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے عباد متقین کی عبادت اور بندگی

کو جب کبھی مقام مدح و ثنا میں ذکر فرمایا ہے تو مقیمین الصلوٰۃ کے ساتھ فرمایا ہے مصلین کا لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال فرمایا ہے کہ جن کی نمازیں سوائے اس سرسری ہیئۃ اور محض ظاہری قیام وقعود کے اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ مقام مذمت میں ایک جگہ ارشاد ہے فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی یعنی اس شخص نے نہ تصدیق کی اور نماز کو قائم اور درست کرنا تو درکنار کبھی اس نے نماز کی ہیئت اور صورت بھی نہ بنائی۔

بعض علماء کے نزدیک اس مقام پر صلوٰۃ سے عام معنی مراد ہیں یعنی خواہ وہ صلوٰۃ مفروضہ ہو یا نافلہ۔ مگر امام رازی یہ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ سے فقط صلوٰۃ مفروضہ مراد ہے اس لئے کہ فلاح جو کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ میں مذکور ہے۔ وہ فقط فرض نماز پر موقوف ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ ایک اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ پانچ نمازیں دن اور رات میں تم پر فرض ہیں۔ اعرابی نے کہا کہ کیا اور بھی کوئی نماز ان پانچ کے علاوہ مجھ پر فرض ہے آپ نے فرمایا نہیں اس کے بعد اس شخص نے زکوٰۃ اور صوم کے متعلق مسئلہ دریافت کیا اور یہ کہتا ہوا رخصت ہوا۔ واللہ لا ازید علی ھٰذا ولا انقص منہ خدا کی قسم اس میں کوئی کمی اور بیشی نہ کروں گا۔ اس وقت آنحضرت نے یہ ارشاد فرمایا۔ افلح الرجل ان صدق یعنی اس شخص نے فلاح پائی اگر سچ کہا۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ اور ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے کچھ حصہ اللہ کے لیے خرچ کرتے ہیں

انفاق سے اس جگہ عام معنی مراد ہیں جو زکوٰۃ اور صدقات نافلہ اور ہر اس انفاق کو جو اللہ کی راہ میں ہو سب کو شامل ہے۔ بعض اہل علم نے باطنی اور معنوی رزق یعنی علم نافع کے انفاق کو بھی اس آیت شریفہ کے عموم میں داخل فرمایا ہے حق تعالیٰ شانہ نے سب سے اول ایمان کا ذکر فرمایا جو تمام اعمال صالحہ میں علی الاطلاق سب سے افضل ہے۔ پھر نماز کا جو عبادات بدنیہ میں سب سے افضل عبادات ہے پھر عبادت مالیہ زکوٰۃ اور صدقات کا ذکر فرمایا اسی لیے صحیحین میں عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام پانچ چیزوں پر مبنی ہے اول شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ دوم اقام الصلوٰۃ سوم ایتاء الزکوٰۃ۔ چہارم صوم رمضان پنجم حج بیت اللہ۔

اور مِمَّا میں مِن تبعیضیہ ہے۔ یعنی مال کا بعض حصہ خرچ کرتے ہیں مسرف اور فضول خرچ نہیں۔ اور مِمَّا رَزَقْنٰھُم کے اپنے عامل یعنی ینفقون پر تقدیم کچھ اہتمام اور اختصاص کی طرف مشیر ہے یعنی ان کے مال کا کچھ حصہ ہمیشہ تصدق اور انفاق کے لیے مخصوص رہتا ہے اور وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ سے مومنین اہل کتاب مراد ہیں جیسے عبد اللہ بن سلام وغیرہ رضی اللہ عنہم وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ اور وہ آخرۃ پر یقین رکھتے ہیں۔ ایقان کو آخرۃ کے ساتھ مخصوص کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ آخرت اور یوم حساب کا یقین متقین کا خاص شعار ہے کسی وقت آخرت سے غافل نہیں ہوتے ہر وقت اسی کی فکر میں لگے رہتے ہیں جس طرح آخرت کا استحضار متقین کا شعار ہے اسی طرح آخرت سے غفلت کافروں کا خاص شعار ہے کما قال تعالیٰ یعلمون ظاہراً من الحیاۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون۔

اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ۔ ایسے ہی لوگ کہ جو اپنی رب کی طرف خاص نور ہدایت پر ہیں۔ کلمہ علیٰ جو استعلاء کے لیے مستعمل ہوتا ہے اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہ لوگ ہدایت پر نہایت حادی اور متمکن ہیں۔ اور من ربھم میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ نور ہدایت اس رب العالمین کے فضل اور رحمت سے ان کو عطا ہوا ہے وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ اور ایسے ہی لوگ مراد کو پہونچنے والے ہیں۔ یعنی مومنین کے یہ دونوں گروہ دنیا میں حق تعالیٰ کی توفیق سے نور ہدایت سے سرفراز ہوئے اور آخرت میں اس کی رحمت اور فضل سے مراد کو پہنچیں گے

صفات کافرین اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا یعنے جو اللہ کے علم میں کافر ہیں اگرچہ وہ ظاہر آ مسلمان ہوں ان کے حق میں آپکا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے وہ ایمان نہ لائیں گے۔ اللہ کے علم میں وہی کافر ہے جس کا خاتمہ اور موت کفر پر ہو۔ جیسے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ اور علی ہذا جس شخص کا خاتمہ ایمان پر ہونے والا ہو وہ حقیقت میں مومن ہے اگرچہ بظاہر کافر ہے سے

بد عمر را نام اینجا بت پرست — لیک مومن بود نامش در الست

گذشتہ آیات میں اہل انعام کا ذکر تھا۔ یعنے جن کو حق تعالیٰ نے ایمان اور تقوی کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اب اس مقام سے اہل غضب اور اہل ضلال کا ذکر فرماتے ہیں۔ ان دو آیتوں میں خالص کافروں کا ذکر ہے اور اس کے بعد تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذکر ہے۔

حرف تحقیق یعنی کلمۂ اِنَّ کا استعمال اکثر اُن مواقع میں ہوتا ہے کہ جہاں مخاطب کو کسی قسم کا کوئی تردد ہو۔ مگر کبھی کبھی ایسے موقعہ پر بھی استعمال ہوتا ہے کہ جہاں متکلم یا مخاطب کے گمان اور خیال کے خلاف کوئی شئے ظاہر ہو۔ جیسے حضرت مریم کا بطور حسرت یہ فرمانا۔ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی (اے پروردگار تحقیق میں نے تو یہ لڑکی جنی ہے) اس لیے کہ حضرت مریم کو امید فرزند کی لگی ہوئی تھی تاکہ بیت المقدس کی خدمت کے لیے اس کو آزاد فرمائیں۔ خلاف امید لڑکی کی ولادت کو بطور حسرت حرف اِنَّ کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اور علی ہذا نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی قوم سے یہ امید تھی کہ وہ میری تصدیق کریں گے۔ جب خلاف امید انہوں نے تکذیب کی تو بطور حسرت یہ فرمایا۔

رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ کَذَّبُوْنِ۔ اے پروردگار تحقیق میری قوم نے تو میری تکذیب کی

اسی طرح اس جگہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی امید کے خلاف کفار کے نہ ایمان لانے کی جو کو اِنَّ۔ حرف تحقیق کے ساتھ ذکر فرمایا کہ اے ہمارے نبی آپ ان کافروں کے ایمان کی امید نہ رکھیں ان کے حق میں آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے یہ ایمان نہ لائیں گے۔

اور سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ۔ اس لیے فرمایا کہ یہ انذار اور عدم انذار فقط کافروں کے حق میں برابر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں برابر نہیں۔ آپ تو منصب نبوت و رسالت کی وجہ تبلیغ احکام اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے مامور ہیں کوئی بدنصیب ایمان لائے یا نہ لائے آپ کو تبلیغ کا اجر بہر حال میں ملیگا۔ اس آیت سے یہ مقصد نہیں کہ آپ ان کو تبلیغ اور ہدایت نفرمائیں۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کے نہ ایمان لانے سے آپ غمگین اور ملول نہ ہوں۔ یہ ایمان لانے والے نہیں۔

یومنون بالغیب کی تفسیر میں ایمان کے ساتھ کفر کی حقیقت بھی امام غزالی سے نقل کرچکے امام فخرالدین رازی قدس اللہ سرہٗ نے جو کفر کی حقیقت بیان فرمائی ہے۔ وہ بہت زیادہ واضح اور کفر کی تمام انواع و اقسام کے لیے حاوی اور جامع ہے۔ وہ یہ ہے۔

الکفر عدم تصدیق الرسول صلی اللہ وسلم فی شئ مما علم بالضرورۃ مجیئہٗ بہ۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۵۹)	یعنی کفر کے معنی یہ ہیں کہ رسول اور پیغمبر کی اس چیز میں تصدیق نہ کرنا کہ جس کا بدیہی اور قطعی طور پر دین سے ہونا معلوم ہو چکا ہے۔

پس کفر کی یہ تعریف (یعنی عدم تصدیق الرسول) تکذیب اور ترک تصدیق دونوں کو شامل ہے اور اگر کفر کی تعریف تکذیب الرسول سے کے ساتھ کی جائے تو یہ تعریف اس شخص پر صادق نہ آئے گی کہ جو نہ تصدیق کرتا ہے اور نہ تکذیب حالانکہ وہ بالاجماع کافر ہے۔ نبی اور رسول کی تصدیق نہ کرنا ہی کفر ہے خواہ تکذیب کرے یا نہ کرے اس لیے مناسب اور بہتر یہی ہے کہ کفر کی تعریف تکذیب کیساتھ نہ کی جائے بلکہ ترک تصدیق کی جائے۔ تاکہ کفر کی دونوں صورتوں پر صادق آسکے۔ قال اللہ تعالیٰ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا۔ یعنی جو خدا اور اس کے رسول کی تصدیق نہ کرے تو ہم نے اس کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ اس آیت شریفہ میں نہ تصدیق کرنے والوں کو کافر کہا گیا ہے۔ وقال تعالیٰ وقال الذین کفروا لن نؤمن بھذا القرآن

وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ ۔ کہا کافروں نے کہ ہم اس قرآن اور گذشتہ کتابوں کی ہرگز تصدیق نہ کریں گے

چنانچہ سورہ صافات میں ہے کہ اہل جنت ۔ اہل نار سے یہ کہیں گے ۔

بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ بلکہ تم تصدیق کرنے والے نہ تھے ۔

اہل جنت ۔ اہل نار کے دائمی عذاب کا سبب عدم ایمان اور ترک تصدیق تبلائیں گے ۔

اور سورۂ قیامہ میں ہے ۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۔ یعنی اس کافر نے نہ تو قیامت وغیرہ کی تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی

اس مقام پر بھی حق تعالیٰ نے کفر کو عدم تصدیق سے تعبیر فرمایا ہے ۔

بلکہ خود یہی آیت یعنی ان الذین کفروا سواءٌ علیھمءانذرتھم ام لم تنذرھم لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ امام رازی قدس اللہ سرہٗ کی تائید کرتی ہے ۔ اس لیے کہ اس آیت میں نہ ایمان لانے والوں اور نہ تصدیق کرنے والوں کو کافر کہا گیا ہے ۔

اقسام کفر | علماء نے کفر کی پانچ قسمیں بیان فرمائی ہیں ۔

(۱) کفر تکذیب یعنی انبیاء و رسل کو جھٹلانا ۔ اور ان کو مفتری اور کاذب کہنا ۔

وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۔ اور کہا کافروں نے یہ ساحر اور جھوٹا ہے ۔

وقال اللہ تعالیٰ

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذو الاوتاد وثمود وقوم لوط واصحٰب الایکۃ اولئک الاحزاب ان کل الا کذب الرسل فحق عقاب

تکذیب کی ان سے پہلے قوم نوح اور قوم عاد اور میخوں والے فرعون اور قوم ثمود اور قوم لوط اور اصحاب ایکہ نے یہی جماعتیں ہیں کفر کی ان سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا پس میرا عذاب انپر ثابت ہو گیا ۔

(۲) کفر استکبار ۔ تکبر کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو نہ ماننا اور اس کے قبول سے

انکار کر دینا۔

ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین ۔ ابلیس نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور تکبر کیا ہو گیا کافروں میں سے

(۳) کفر اعراض یعنی پیغمبر کی نہ تصدیق کرے نہ تکذیب بلکہ اعراض اور روگردانی کرے۔

کما قال تعالیٰ

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَمَّا اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ اور کافر جس چیز سے ان کو ڈرایا جاتا ہے اس سے اعراض کرتے ہیں

شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ معرضون کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ دھیان نہیں کرتے یعنی نبی کی نصیحت کی طرف توجہ اور التفات نہیں کرتے ۔

وقال اللہ تعالیٰ شانہٗ

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ۔ کہدیجیے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی پس اگر روگردانی کریں تو فرما دیجیے کہ اللہ کافروں کو محبوب نہیں رکھتا ۔

اس آیت شریفہ میں روگردانی کرنے والوں کو کافر فرمایا ہے۔ اور قرآن عزیز میں تولی اور اعراض کو بکثرت ذکر فرمایا ہے۔

(۴) کفر ارتیاب۔ یعنی پیغمبر کے نہ صادق ہونے کا یقین ہے نہ کاذب ہونے کا بلکہ نبی کے صدق اور کذب میں اس کو شک اور تردد ہے ۔ کما قال اللہ تعالیٰ۔

وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ وَّقَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ وَاَنّٰی لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ وَقَدْ کَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ اس کے بعد ان کی کافر ہونے کی علت بیان فرماتے ہیں۔ اِنَّهُمْ کَانُوْا فِیْ شَکٍّ مُّرِیْبٍ۔

(۵) کفر نفاق یعنی زبان سے اقرار اور تصدیق اور قلب سے تکذیب کرنا۔ اور ومن

الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھم بمومنین۔ سے دور تک اسی کفر نفاق کا بیان ہے۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرۂ آفاق تصنیف

تمدّنِ عرب

جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ
نواب جیون یار جنگ بہادر بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا منصرم چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے

عالمانہ، مبصرانہ، ناقدانہ، مقدمہ اور فاضل مترجم

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۲۷) سادہ تصاویر (۳) نقشوں کے ہمراہ
جس کی قیمت پچاس روپے تھی مگر سو روپے میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اب

اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن مدظلہ

کے جشن سیمیں کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کی جانب سے شائع ہو چکی ہے
قیمت صرف پچیس روپے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

عبدالقادر

پبلیشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پرائٹر اعظم اسٹیم پریس چارمینار
حیدرآباد دکن
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن